اپنی نگاہ
عورتوں کی لکھی تخلیقات اور تنقیدی جائزے
ترتیب :
جویریہ خالد
ثمینہ رحمان

عورتوں کی لکھی تخلیقات اور تنقیدی جائزے

ترتیب

جویریہ خالد

ثمینہ رحمان

ASR

اپنی نگاہ: عورتوں کی لکھی تخلیقات اور تنقیدی جائزے

1995ء میں پہلی دفعہ چھپی

اثر پبلی کیشنز

فلیٹ نمبر 5.6 تھرڈ فلور

شیراز پلازہ مین مارکیٹ گلبرگ II

پی او بکس 3054 لاہور پاکستان

فون: 877496 - 877613

ترتیب

جویریہ خالد

ثمینہ رحمان

کور: دریہ قاضی

طابع: نیوزا پبلشرز لاہور

اپنی نگاہ

فہرست

تعارف

پہلا حصہ: تنقیدی جائزے

اردو شاعری میں جدید پاکستانی عورت کی حسیت کا اظہار	شاہدہ حسن	۹
اردو افسانہ، کرب، آگہی اور خواتین افسانہ نگار	ام عمارہ	۲۷
پنجابی ادب وچ عورت دا روپ	ثروت محی الدین	۴۱
سندھی عورت کی کہانی	عطیہ داؤد	۴۷
خواتین اور ادیب خواتین کے مسائل	مسرت لغاری	۶۱
عورت بطور فرد کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی شاعری میں	ارشاد خالد	۶۴
لکھنے والیوں کی تنہائی	کشور ناہید	۷۴
سارا میری دوست	عطیہ داؤد	۷۶
زینب نور کی روداد	مسرت لغاری	۹۰

دوسرا حصہ: شاعری

بارہویں ترمیم میں ترمیم	کشور ناہید	۹۷
وینا حیات اور آسیہ ایوب کی فرد جرم		۹۸
ہم گنہگار عورتیں		۱۰۰
موم محل		۱۰۲
آس رکھنا	فرحت پروین	۱۰۴
بوڑھی ماں	گلنار	۱۰۶
آزادی چھیننے والو	نسیم بانو	۱۰۹
چتا ایک عورت کی	شہناز مزمل	۱۱۱

عنوان	شاعرہ	صفحہ
موم کے سائباں		۱۱۵
غزل	در انجم عارف	۱۱۷
واپسی		۱۱۸
میں دکھیاری مورکھ ناری		۱۱۹
کڑیاں چڑیاں	ثروت محی الدین	۱۲۱
اج دا سورج چڑھیا		۱۲۲
دوروں نیڑیوں		۱۲۳
عورت		۱۲۵
غزل	شاہدہ حسن	۱۲۷
آج کے دن کے نام		۱۲۸
میں کہاں ہوں	عذرا عباس	۱۳۲
بیزاری آتی ہے		۱۳۴
یہ کام جو میں کر رہی ہوں		۱۳۶
پیار کی سرحدیں	عطیہ داؤد	۱۳۸
محبتوں کے فاصلے		۱۴۰
شرافت کا پل صراط		۱۴۱
سزا کی منتظر ایک باغی لڑکی	بشریٰ اعجاز	۱۴۲
ننگے پاؤں		۱۴۵
میں عورت ہوں		۱۴۶
نیلا بستر		۱۴۷
آگہی		۱۴۷
اپنے بیٹے کیلئے ایک نظم	پروین شاکر	۱۴۸
بشیرے کی گھر والی		۱۵۱
موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والی	شبنم شکیل	۱۵۴

غزل		۱۵۵
ایک دفعہ کا ذکر ہے		۱۵۶
ورثہ		۱۵۷
چادر اور چار دیواری	فہمیدہ ریاض	۱۵۹
ایک لڑکی سے		۱۶۳
کب تک		۱۶۴
مقابلہ حسن		۱۶۵
گفتگو شاہین خوشخصال و شیریں مقال		۱۶۶
کلام میں آنچ کیوں نہیں ہے		۱۶۸

تیسرا حصہ: افسانے

بارہ آنے کی عورت	بشریٰ اعجاز	۱۷۳
درد کا رشتہ	سعیدہ گزدر	۱۸۴
گلابوں والی گلی	نیلم بشیر	۲۰۷

تعارف

"اپنی نگاہ" سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کی اپنی نگاہ جس سے کہ وہ خود کو دیکھتی اور اپنے بارے میں سوچتی ہے۔ مردوں نے بھی عورتوں کے بارے میں بہت لکھا ہے لیکن اب اس ابتداء کو جاری رہنا چاہئے کہ عورت خود اپنے آپ کو جانے اور اپنے مسائل پر بات کرے۔

عورت کی اپنی نگاہ سے خود کو دیکھنے میں ایک فرق ہوگا۔ یہ فرق اس کی ذات کا تجربہ ہے برصغیر کے ادب میں خواتین لکھنے والیوں کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے موضوع، اسلوب، ہیت اور مواد کے لحاظ سے غیر روایتی اور انقلابی تحریریں پیش کی ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے سے لے کر اب تک عورتوں کی تحریروں میں ہر طرح کا موضوع دیکھنے میں آیا ہے اور بہت سی لکھنی والیوں نے سماجی مسئلوں کے ساتھ سیاست کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے یا یوں کہنا صحیح ہوگا کہ سیاسی حالات کا اثر ان کی تحریروں میں نظر آتا رہا ہے جیسے کہ مارشل لاء کے زمانے میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، سعیدہ گزدر اور کئی دوسری عورتوں نے امتیازی قوانین اور سلوک کی بات اپنی نظموں اور کہانیوں میں کی ہے۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش کی تقسیم کے وقت بھی بہت سی خوبصورت کہانیاں خواتین نے لکھی ہیں۔

پاکستان کی خواتین کے بہت سے کام دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے کئے گئے ہیں جو کہ اس بات کے شاہد ہیں کہ پاکستانی خواتین کی تخلیقات کو خواتین کی جدوجہد اور حالات سمجھنے کے لئے بطور حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔

اثر کا نظریہ عورتوں کی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں ہمیشہ بہت مثبت رہا ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کو ہمیشہ ترقی کا ایک حصہ سمجھا ہے۔ اثر نے ان تخلیقی صلاحیتوں کی پہچان ترقی کے ایک اہم ستون کی حیثیت سے کروائی ہے۔

یہ ہی وجہ ہے کہ لاہور میں ہونے والی مارچ 94ء کی وومن اسٹڈیز کانفرنس میں جہاں دوسری ورکشاپوں کا انعقاد کیا گیا ان میں خواتین لکھنے والیوں کی

ورکشاپ بھی ایک تھی جس میں تمام ملک کی خواتین لکھنے والیوں کو موقع ملا کہ وہ سب مل بیٹھیں اور خود اپنے کام اور مسائل پر بات کریں۔

خواتین لکھنے والیوں کو اکثر معاشرے کی دوسری عورتوں کی طرح مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کے کام پر تنقید کرنے والے مرد حضرات عورت کی تحریر کے بجائے انکی ذات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ مردوں کے اس معاشرے میں مرد لکھنے والے کو لکھنے کے وقت گھر میں ہر طرح کا سکون اور خاموشی دی جاتی ہے جبکہ عورت لکھنے والیوں کو اس قسم کا سکون میسر نہیں آتا۔ اس کے باوجود عورتیں جدید موضوعات پر لکھ رہی ہیں جنہیں کہ مناسب پہچان نہیں ملتی۔ جب بھی لکھنے والی عورتوں نے مردوں کی بنائی ہوئی حدود سے باہر نکل کر لکھا ہے اسے پسند نہیں کیا گیا۔ سنجیدہ اور نئے موضوعات پر تحریروں کو ٹی وی، ریڈیو پر اہمیت نہیں دی جاتی ہے خاص طور پر نسوانیت کے موضوع پر لکھے ہوئے کام کو بہت کم ذرائع ابلاغ میں جگہ دی جاتی ہے خواتین لکھنے والیوں کو مرکزی اور صوبائی سطح پر علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں میں بہت کم نمائندگی دی جاتی ہے۔

خواتین لکھنے والیوں نے عورتوں کے ساتھ یکجہتی میں بہت لکھا ہے انہوں نے عورتوں کی تنہائی المیہ، اکیلی عورت، بے نام عورت، مذہبی جنونیت، امتیازی قوانین، مردوں کی جاگیردارانہ ذہنیت اور منافقانہ رویے، روایت شکن عورت، نا تمام ذمہ داریاں اور عورت مرد کے رشتے کی بے اساسی کیفیات جیسے موضوعات پر لکھا ہے خواتین لکھنے والیوں میں سے کچھ باقاعدہ عورتوں کی تحریک کا عملی طور پر حصہ بھی رہی ہیں اور انہوں نے سزائیں بھی پائی ہیں۔ مارشل لاء دور میں فہمیدہ ریاض کو سنگین سیاسی الزامات میں ملوث کیا گیا کشور ناہید اور سعیدہ گزدر کی کتابوں کو اس زمانے ہی بین کر دیا گیا۔

باوجود اس کے کہ لکھنے والی عورتوں نے عورتوں کی تحریک میں حصہ لیا لیکن شعوری رابطے عورتوں کی تحریک کے ممبران اور لکھنے والیوں کے درمیان نہیں بن سکے۔ لکھنے والیوں کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا ہے کہ تحریک کی عورتوں نے انکا ساتھ نہیں

دیا جبکہ عورتوں کی تحریک کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان غلط فہمیاں ہیں جو کہ دور ہونی چاہئیں۔ اثر نے لکھنے والیوں اور عورتوں کی تحریک کے درمیان رابطے بنانے کی کوشش کی ہے لاہور' کراچی اور پشاور میں اس سلسلے کی ابتدائی میٹنگز ہو چکی ہیں اور امید ہے کہ لاہور میں 21 سے 23 اپریل کو ہونے والی سرگرم افراد کی اسمبلی/کانفرنس میں یہ سب مل بیٹھیں گی اور اس سے آپس کے مزید رابطے بڑھیں گے ان رابطوں کو بڑے شہروں سے چھوٹے شہروں اور قصبوں تک لے جانے کی ضرورت ہے تاکہ ملک کی عورتیں اکٹھی ہو سکیں اور اپنی تحریک کو مضبوط کریں اور آگے بڑھائیں۔

اس کتاب میں عورتوں کی تحریروں کے تنقیدی جائزے اور ان کی اپنی کہانیاں اور نظمیں جو کہ انہوں نے مشاعرہ اور ورکشاپ کے دوران پڑھی اور بھیجی تھیں وہ سب شامل ہیں اس کتاب کو چھاپنے کا مقصد یہ ہے کہ لکھنے والیوں نے کس قدر اور جدید موضوعات پر لکھا ہے۔ لکھنے والیوں کی مختلف جہتوں میں ہوئے کام کو منظرعام پر لانے اور اسکی پہچان کرانے کی ضرورت ہے۔

ورکشاپ اور مشاعرے میں تمام مضامین اور نظمیں غزلیں کہانیاں جو سب پڑھی اور بھیجی گئی تھیں ہم نے ان تمام کو شامل کیا ہے ہو سکتا ہے کہ آپ کو کچھ لکھنے والیوں کا زیادہ کام نظر آئے اور کچھ کا کم اس میں اثر نے کسی کے بھی کام کو کاٹا یا کم نہیں کیا ہے اثر اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ عورتوں کے کام پر جو آدمیوں کی طرف سے عائد سنسرشپ ہے اور انہیں اپنے کام کو چھپوانے کیلئے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے لکھنے والیوں کے تمام کام کو چھاپنا چاہئے تاکہ اس سے انکی سوچ کے تمام پہلو عیاں ہوں اور ان کی حوصلہ افزائی ہو۔

پاکستان میں عورتوں نے عورتوں کی تحریروں پر بہت کم تنقیدی کام کیا ہے پہلی دفعہ اس قدر تنقیدی جائزے اس ورکشاپ میں پیش کئے گئے ہیں جن کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

شاہدہ حسن کا مقالہ "اردو شاعری میں جدید پاکستانی عورت کی حسیت کا

Scanned by CamScanner

اظہار" ایک نہایت جامع شعری مقالہ ہے انہوں نے پچھلی چار دہائیوں میں عورتوں کے لکھے گئے مختلف شعری مجموعوں کا جائزہ لیا ہے وہ ادا جعفری سے زہرہ نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، سارہ شگفتہ عذرا سہگل سے لے کر نسرین انجم بھٹی، یاسمین حمید تک شاعری میں انکے مختلف ادوار کا جائزہ لیا ہے کہ کیسے ان سب کی شاعری میں ناآسودہ عورت کی آوازیں ہیں جو گھٹن جبر کی فضا سے باہر نکل کر اپنی ذات کے بھرپور اظہار کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

ام عمارہ اردو افسانہ کرب آگہی اور خواتین افسانہ نگار میں افسانے کے بے پناہ موضوعات جنہیں مختلف زمانوں میں برصغیر کی عورتوں نے لکھا ہے اور پھر وہ پاکستان میں افسانہ لکھنے والیوں کے کام کی مثالیں اور موضوعات کی نشاندہی کرتی ہیں اور لکھتی ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ افسانہ روبہ زوال ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے افسانہ اس دن تک باقی رہے گا جب تک قیامت نہیں آ جاتی اور جب قیامت آئے گی تو وہ بھی ایک کہانی ہو گی اور کیا پتہ کہ اسکی تخلیق کار بھی کوئی بنت حوا ہو۔

ثروت محی الدین "پنجابی ادب وچ عورت دا روپ" میں لکھتی ہیں کہ مردوں کے بنائے ہوئے معاشرے میں عورتوں کے نام اٹھارویں صدی سے پہلے نظر نہیں آتے ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ انکے لکھے کام کو چھاپا نہیں جاتا تھا پھر وہ صوفی شعراء کے کلام میں عورتوں کے استعارے جس طرح استعمال ہوتے ہیں انہیں مثالوں کے ساتھ بیان کرتی ہیں اور اس بات کی اہمیت پر زور ڈالتی ہیں کہ آجکل کی عورت کو عورتوں کی صدیوں پرانی تحریک کو اب آگے بڑھانا ہے۔

عطیہ داؤد سندھی عورت کی کہانی میں متبادل اور مروجہ تعلیم کے ذریعوں میں جس طرح سے عورت کی مرد کے مقابلے میں کم حیثیت کو بیان کیا جاتا ہے اسکی مثالیں دی ہیں وہ سندھی کہاوت، لوک گیت، نصاب میں جنسی امتیاز اور پھر وہ سندھی سیاسی اور سماجی شعبوں سے تعلق رکھنے والی عورتوں کی کہی باتیں سندھی عورت کی حالت کے تجزیئے کے طور پر بیان کرتی ہیں اور اس بات کی اہمیت پر زور دیتی ہیں کہ لکھنے والیوں کو ہر طبقے کی عورتوں پر لکھنے کی ضرورت ہے۔

مسرت لغاری "خواتین اور ادیب خواتین کے مسائل" میں لکھتی ہیں کہ خواتین کن مسائل سے دوچار ہیں اور لکھنے والی خواتین کو اپنی لکھی کہانی اور کام کا چھپوانا کس قدر مشکل ہوتا ہے آخر میں وہ تجاویز بیان کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ادیب خواتین کے مسائل کا حل کوئی مشکل نہیں ہے۔

ارشاد خالد "عورت بطور فرد کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی شاعری میں" لکھتی ہیں کہ شاعری جس میں عورت کا اظہار ایک فرد کے طور پر بہت کم ہے لیکن پاکستان کی اردو شاعری میں وہ کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے نام لیتی ہیں اور کشور کی شاعری میں غزل، آزاد نظم اردو شعری نظم کے چونکا دینے والے موضوعات کی مثالیں دیتی ہیں فہمیدہ ریاض کے مختلف مجموعات میں جس طرح سے انہوں نے عورت کو بطور فرد دیکھا ہے اس کو بیان کیا ہے اور کہتی ہیں کشور اور فہمیدہ کی شاعری میں مرد شاعروں کے من اور تن کا Dilemma موجود نہیں ہے۔

کشور ناہید "لکھنے والیوں کی تنہائی" میں لکھتی ہیں کہ اسکے باوجود کہ لکھنے والیوں نے نظم نثر اور شعر میں بہت کام کیا ہے مگر ان عورتوں کا ذکر ایک پیراگراف کی تیرہ لائنوں سے نہیں بڑھتا ہے اور پھر وہ مردوں کی طرف سے عورتوں کے کام پر تنقید اور رویئے کی مثالیں دیتی ہیں وہ نوجوان نسل کی ادب کے بارے میں روئیوں کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انہیں ہماری تحریروں میں ناپسندیدہ سچ کی بو آتی ہے ایسے حالات میں پڑھنے والے اور نقاد کہاں سے آئیں گے۔

عطیہ داؤد کا "سارا میری دوست" اس کی زندگی کی متنازعہ شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ یہ دیباچہ ہے جو کہ انہوں نے سندھی زبان میں لکھا تھا۔ کتاب کا نام "ایک تھی سارہ" ہے۔ جس کے لئے انہوں نے لکھا ہے اور یہ اس کا ترجمہ ہے۔ اس میں عطیہ نے سارہ کے متعلق ہونے والی بہت سی باتوں کا جواب دیا ہے جو کہ امرتا پریتم کے اس کی زندگی کے بارے میں لکھی ہیں۔ عطیہ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ لوگوں نے اس کی شاعری سے زیادہ اس کی شخصی زندگی کو اہمیت دی ہے۔

"زینب نور کی روداد" مسرت لغاری نے زینب نور کے واقعے سے متاثر

ہو کر اردو کے اخبار جنگ میں ایک خط جو کہ ناراض خاتون کا خط کے نام سے چھپا تھا لکھا اسکی اہمیت اسلئے زیادہ ہے کہ یہ اس کانفرنس کے دوران اخبار میں چھپا اور لوگوں نے اسے بہت پسند کیا اور متاثر ہوئے حکومت کی طرف سے اس خط پر انہیں انعام بھی ملا اس خط میں انہوں نے عورتوں کی حالت کے بارے میں حکومت کی ذمہ داریاں اور مردوں کے تعصب پر لکھتی ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں مشاعرہ میں حصہ لینے والی شاعرات کے کلام کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس مشاعرہ کی اہم بات یہ تھی کہ اس میں وہ شاعرات جو کہ عورتوں کے موضوعات پر لکھتی ہیں انہوں نے اپنی منتخب نظمیں اور غزلیں سنائیں جبکہ وہ شاعرات جو کہ خاص عورتوں کے حقوق اور ناانصافی پر نہیں لکھتیں انہوں نے بھی اپنے کلام میں سے عورتوں پر لکھا ہوا کلام پڑھ کر سنایا۔ فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، شبنم شکیل، پروین شاکر، بشریٰ اعجاز شاہدہ حسن در انجم عارف، شہناز مزمل، ثروت محی الدین کے علاوہ نئی لکھنے والیوں میں سے گلنار فرحت پروین اور نسیم بانو نے بھی اپنی نظمیں سنائیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی اور سندھی زبان میں بھی شاعرات نے اپنا کلام سنایا۔

اس کتاب کے تیسرے حصے میں افسانے شامل ہیں بشریٰ اعجاز کی لکھی ہوئی "بارہ آنے کی عورت" سعیدہ گزدر کی کہانی "درد کا رشتہ" اور نیلم احمد بشیر کی " گلابوں والی گلی" شامل ہے۔ ان کہانیوں میں انہوں نے عورت کی حیثیت، خاوند کا باہر جانا، عورت کی جنسی ضرورت، نوجوان بچیوں کو شہر کی گلیوں میں ہراساں کرنا، جنگ کا لوگوں کے رشتوں کو ختم کرنا، ثقافت کو بھولنا، کراچی کے حالات جیسے بہت سے مسئلے شامل ہیں جن پر انہوں نے لکھا ہے۔

آخر میں ہم تمام لکھنے والیوں سے کتاب میں اگر کوئی غلطیاں رہ گئی ہوں اس پر معذرت چاہتے ہیں۔ نورین امجد کا شکریہ جنہوں نے کام اکٹھا کرنے میں مدد دی۔

شکریہ

جویریہ خالد

ثمینہ رحمان

پہلا حصہ

تنقیدی جائزے

اردو شاعری میں جدید پاکستانی عورت کی حسیت کا اظہار

شاہدہ حسن

نئی شاعری میں جدید پاکستانی عورت کی حسیت کا اظہار کے حوالے سے اپنے بے شمار موضوعات زیر بحث لائے جا سکتے تھے جن پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور ادب کے پس منظر میں، عورت کی شخصیت، اسکی سائیکی اور اسکے وجود کی مختلف جہتوں کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا جا سکتا ہے کہ آج جبکہ عورت اپنی ذات اور اپنے وجود کی ہمہ گیریت کا تعارف کرانے کی شدید ضرورت کا اندازہ لگا کر برملا اظہار پر مجبور ہو چکی ہے، اسکے وجود کی رنگارنگی نے کیسے کیسے نئے رخ اور زاویئے متعین کر دیئے ہیں اور افسانے اور شاعری اور فنون لطیفہ کے دیگر مظاہر میں وہ اپنے خدوخال کی صورت گری کرتے ہوئے اپنے تشخص کی کون کون سی منازل کو طے کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے اس اہم موضوع یعنی "عورت اور ادب" کو برتنے کی ایک صورت تو میرے لئے یہ تھی کہ تاریخی پس منظر میں اور حقیقی نقطہ نظر سے ان تمام تفصیلات کا جائزہ لوں جو سماجی، معاشرتی، معاشی اور تہذیبی اعتبار سے بدلتی ہوئی صورت حال میں ایک بالکل مختلف ماحول اور مختلف رویوں میں گھری ہوئی جدید عورت کے ذہن کا مطالعہ کرنے میں نہ صرف مدد دیں بلکہ یہ بھی روشنی ڈالیں کہ اس نئے ماحول کا پیداواری ذہن "عورت ہونے کے تجربے" کی معنویت کو کیونکر اجاگر کر رہا ہے۔ کیونکہ عورت کا عورت ہونا، بذات خود ایک اہم تجربہ ہے اور اس تجربہ کی تکذیب کی کہانی انسانی تمدن کی کہانی کے ساتھ ساتھ آج تک جاری و ساری ہے لیکن یہ تمام تفصیلات بلا شبہ ایک بے حد طویل تحقیقی مقالے کی طالب تھیں اور یہ کانفرنس جس میں میرے علاوہ دیگر مقالہ نگار خواتین بڑی تعداد میں شرکت کر رہی ہیں اتنے طویل مقالے کی متحمل نہیں ہو سکتی --- مناسب بات میرے لئے یہ ہے کہ میں اس موضوع کو برتنے کی دوسری صورت

کی جانب آجاؤں یعنی ایک خاص عرصے کا تعین کرتے ہوئے قلم کار خواتین کے تخلیقی اظہار کے مختلف تجزیوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کروں کہ ایک مخصوص ماحول میں عورت اپنے سماجی' معاشی اور تہذیبی مناصب سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے' احساس کی سطح پر جن تجربات سے گزر رہی ہے ان کی نوعیت کیا ہے اور آیا ان میں محرومی اور لاحاصلی کا احساس غالب ہے یا اس لذت کا جو ایک احساس سرخروی میں مگن رہنے سے حاصل ہوتی ہے اور اسکا ہر اٹھنے والا قدم اسے واقعی اگلی منزلوں کی خبر دے رہا ہے یا نہیں۔ "نئی شاعری میں جدید پاکستانی عورت کی حسیت کا اظہار" کے تحت میں میں اس تجزیئے کو ان چند تازہ تر شعری مجموعوں تک محدود رکھ رہی ہوں۔ جو گزشتہ تین چار دہائیوں میں سامنے آئے ہیں اور جہاں تخلیقی سطح پر عورت نے نہ صرف ایک بے حد حساس اور زندگی کی نئی معنویت سے آگاہ ذہن کی بیداریوں کے ساتھ' زندگی کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت کا اندازہ کروایا ہے بلکہ اس اعتماد کا اظہار بھی کیا ہے جو اس صلاحیت کے نتیجے میں اس میں پیدا ہوا ہے یوں تو یہ فہرست بھی کچھ کم طویل نہیں اور بہت سے نام طوالت کے پیش نظر مذکور ہونے سے رہ جائیں گے لیکن بحیثیت مجموعی عورت کے اس ادبی تشخص سے یہ صورت حال ضرور سامنے آئے گی کہ ایک جانب اگر پاکستان کے استحصالی اور روایتی معاشرے کی بے شمار سماجی اور معاشرتی ناانصافیوں میں گھری ہوئی عورتوں کی ایک بڑی تعداد ابھی "احساس زیاں" سے بھی نابلد نظر آتی ہے تو دوسری جانب تعلیم یافتہ اور حساس وجود رکھنے والی خواتین کی کچھ نہ کچھ تعداد ایسی بھی ضرور موجود ہے جو اپنے اندر کی توانائیوں کا تخلیقی سطح پر اظہار کرکے یہ احساس دلانے پر قادر ہیں کہ وہ کون کون سے عوامل ہیں جو اس استحصالی معاشرے میں جڑیں پکڑ چکے ہیں اور جن سے چھٹکارا پائے بغیر' پاکستانی معاشرہ' جدید عہد میں ایک متوازن اور مربوط تہذیبی سفر سے محروم رہنے پر مجبور رہے گا۔

اگر ہم اردو ادب کی مختلف اصناف میں مختلف موضوعات کے تحت تاریخی تجزیے سے کام لیں تو اندازہ ہوگا کہ کسی نہ کسی حوالے سے عورت ہمیشہ ادب

کا ایک اہم موضوع رہی ہے۔ داستانوں' افسانوں' کہانیوں اور ناول میں اگر عورت کی ذات اور اسکی شخصیت کے مختلف روپ کو نت نئے زاویوں سے پیش کیا جاتا رہا ہے تو شاعری میں بھی شعراء کا اہم ترین موضوع "عورت" ہی رہی ہے۔ عورت اس کا حسن و جمال' اسکے خال و خد کی کشش' اس کی زلفوں کے پیچ و خم اور مرد سے اسکے رومانوی اور جذباتی تعلقات کے پر لطف بیانات سے ایک عرصے تک ہمارے شعراء اپنی شاعری کے خال و خد سنوارتے رہیں ہیں۔ کبھی کبھی مولانا حالی جیسا شاعر عصری تقاضوں کے پیش نظر اپنی مشہور نظم اے ماؤں' بہنوں بیٹیوں میں عورت سے خطاب کرتے ہوئے اسکے روایتی مثالی کردار اور اس کی عظمت و تقدس کی اثر انگیزیوں کو اجاگر بھی کرتا ہے تو اسکا معیار مذہبی اور اخلاقی معاشرے کا دیا ہوا تصور ہی ٹھہرتا ہے ابتدا میں یہ بھی ہوا ہے کہ کسی باشعور اور تخلیقی کرب سے آشنا عورت نے خود اپنے اظہار کے لئے قلم اٹھانا چاہا بھی تو روایتی معاشرے کے مخصوص مزاج کے پیش نظر اسے اپنے اصل نام کے بجائے مردانہ ناموں سے اظہار کی پابندی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑا۔ اگر ان تمام اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کا وجود اپنے فطری جذبات اور اپنی مخصوص سوچ و فکر کے حوالے سے ایک طویل عرصے تک اپنی فطری بے ساختگی کے اظہار سے محروم رہا ہے بالاخر اس شعری سفر میں وہ منزلیں بھی آئیں جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں نے عورت کے حسن و جمال سے فرصت طلب کر کے زندگی کی اور بہت سی کھلی ہوئی سچائیوں سے آنکھیں ملا کر گفتگو کرنے کے فن کا آغاز کیا۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اس انکشاف سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئے عصری تقاضوں نے نہ صرف عورت اور مرد کے مروجہ روایتی رشتے کی معنویت کو بدلنا شروع کر دیا تھا بلکہ اب مرد اور عورت ایک دوسرے کو نئی زندگی کے تناظر میں نئی توقعات کے ساتھ دیکھنے لگے

تھے۔ اردو شاعری نے عورت اور مرد، دونوں کے اس بدلتے رویئے کا گہرا اثر قبول کرنا شروع کیا اور وہ تمام تر شاعری جو اب تک مرد حضرات، نسوانی جذبات کے بیان کیلئے "حرف تانیث" کے ساتھ رقم کیا کرتے تھے یا جو جذبہ تخلیقی اظہار پر قادر خواتین "حرف تذکیر" کے ساتھ ادا کیا کرتی تھیں اب ایک بالکل مختلف اور نئے لہجے، نئے تخاطب اور نئی جمالیات کے ساتھ اظہار پانے لگی۔

بدایون کی نوجوان شاعرہ "ادا بدایونی" جو بعد میں دنیائے ادب و شعر میں "ادا جعفری" کے نام سے معروف ہوئیں اپنے پہلے مجموعہ کلام "ساز ڈھونڈتی رہی" میں جو 1947ء میں ترتیب پا کر 1950ء میں شائع ہوا اس گھٹن اور اس حبس کا احساس دلاتی نظر آتی ہیں جو ایک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی کے ذاتی احساسات اور شخصی تجربات کی بنیاد بن گیا تھا۔ ادا جعفری کے شعری سفر کا آغاز ہوا تو پھر وہ احساس کرب جو محض ایک خواہش کے روپ میں سامنے آیا تھا اب صدائے احتجاج بن کر ابھرنے لگا۔ یہ کم و بیش وہی زمانہ تھا جب مغرب کی عورت، نہ صرف انتخابات میں حق رائے دہی حاصل کرنے کی ابتدائی منزلوں کے بہت آگے نکل کر اپنے حقوق کی تحریک میں سرگرم ہو چکی تھی بلکہ اس تحریک نسواں کے نتیجے میں مکمل قانونی، سماجی، سیاسی اور معاشی مساوات کا مطالبہ لے کر اپنی بھرپور جدوجہد کا آغاز کر چکی تھیں ایسے میں ہندوستان اور پاکستان کی وہ عورتیں جو نسبتاً" مراعات یافتہ خاندانوں سے متعلق تھیں۔ ایک نئی سوچ پر مائل نظر آنے لگیں لیکن پھر بھی ان کے چاروں طرف بنے ہوئے جال میں مذہب، قانون اور اخلاقیات کے ایسے تانے بانے موجود تھے جن کے درمیان کوئی راستہ بنا لینا کار دشوار تھا۔ اسی حبس، گھٹن اور نامعلوم انتظار نے نڈھال شاعرہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں شامل نظم "بیزاری" میں اپنے جذبوں کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

بیزاری

ادا جعفری

زیست اک خواب طربناک و فسوں ساز سہی

رس بھرے نغموں کی اک دلنشیں آواز سہی
رقص محفل بھی زر و سیم کی جھنکار بھی ہے
جنت دید بھی ہے، عشرت گفتار بھی ہے
چشم سرشار کا اعجاز سہی
زیست اک خواب طربناک و مسنوں ساز سہی
قہر ہے اف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود
یہ خموشی، یہ تسلی، یہ گرانبار سکوت
شوق کو رخصت پرواز نہیں
رفعت روح کا درباز نہیں
چشم آسودہ سہی، روح مگر ہے بیتاب
ایک بے نام تغیر کیلئے
درد کی ٹیس سہی الفت جاوید نہیں
نغمہ امید نہیں
سوچتی ہوں کہ کوئی حجلہ تاریک ہے کیا
یہ گرانبار تسلسل، یہ حیات جامد
جسکی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں۔ کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اداس
نور و نکہت سے گریزاں، مہ و انجم سے معود
جسکی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کاش پڑ جائے کہیں ایک خراش ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی
اور بھولے سے کبھی، کوئی آوارہ سی چنچل سی کرن آنکلے
ایک لمحے کیلئے میرے تاریک گھروندے میں اجالا ہو جائے

ادا جعفری کے یہاں "اجالے کی یہ خواہش" محض ایک فرد کی خواہش بن کر سامنے نہیں آتی بلکہ اس عصری آگہی کا سراغ دیتی ہے جسکے بغیر تخلیقی سطح پر ایک اثر انگیز اظہار ممکن ہی نہیں تھا۔

ادا جعفری سے زہرہ نگاہ تک آتے ہوئے اس شعری سفر میں عورت حبس اور گھٹن کی کیفیت سے نکل کر اپنی طویل مسافتوں کی تھکن میں گرفتار نظر آنے لگتی ہے۔ وہ تھکن جو کبھی "لاحاصل" کا احساس اس طرح دلانے لگتی ہے کہ بالآخر ایک گہرے کرب کے طویل تجربے کی بے لذتی کا اظہار ہونے لگتا ہے۔

آنگن

زر، دیوار، دریچے، آنگن
دہلیزیں، دالان اور کمرے
سارے روپ یہ کتنے نازک
سوچو تو مٹی کے کھلونے
میرے لئے یہ کنج عبادت
میرے لئے یہ کوہ صداقت
میرے لئے یہ منزل وعدہ
خلد تحفظ، قصر رفاقت
جس کے راج سنگھاسن بیٹھی
میں رانی ہوں میں بیچاری
باہر چاہے طوفان آئیں
لیکن یاں سب چین سے سوئیں
جب جاگیں، تب سورج نکلے
سو جائیں تب چاندنی مہکے
میرے گھر والے جیتے ہیں
میرے نام کی جے مالائیں

بال بال موتی پرواؤں
پور پور میں ہیرے پہنوں
کام کاج کا پلو ڈالے
دن بھر گھر میں الجھوں سلجھوں
رات کو لیکن آنکھیں موندے
پچھلی رت کا ساون دیکھوں
ہیرے لعل بکھرتے جائیں
محل دو محلے بنتے جائیں
چھوٹا آنگن بچے کھیلے
دور دور سے ہاتھ لائیں
بیتے لمحے جگنو ایسے
اڑتے اور چمکتے آئیں
جگ مگ جگ، مگ سونے جیسا
گھر سب کی نظروں میں آیا
بھیگا آنچل، پھیلا کاجل
کسی نے دیکھا کسی نے چھپایا

زہرہ نگاہ نے اپنی شاعری میں گھر کی بنیادوں میں وفا کے بیج بوتی رشتوں کی تہذیب کرتی اور رفاقتوں کو نئے معنی پہناتی ایک ایسی عورت کے شب و روز رقم کئے ہیں جسکی آواز میں ابتدا ہی سے سپردگی کا رس موجود ہے اور جسکے دست محبت میں دعا کے ان گنت پھول کھلے رہتے ہیں۔ رفاقتوں اور محبتوں کے اس سفر میں اسکے جسم پر سارے زخم اپنے ہی ہاتھوں کے لگائے ہیں لیکن جو محض ایک امید کو بھروسہ بنا کر زندگی کے نت نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتی ہے زہرہ نگاہ کے یہاں روایتی عورت کے جتنے بھی روپ نظر آتے ہیں ان میں ذاتی زندگی کے تلخ و شیریں لمحوں کی آمیزش کے ساتھ ساتھ اس عورت کے وجود کا احساس بھی اجاگر ہوتا ہے جو اس استحصالی

معاشرے کی کڑی دھوپ تاپتے تاپتے اب کندن بن چکی ہے اور یہ احساس دلا کر کہ۔

ہمارے اور تمہارے راستوں میں کہیں بھی آشنا سورج، نہیں ہے
یہ ظاہر ساتھ چلتے جا رہے ہیں کوئی بھی مشترک سایہ نہیں ہے
ہماری شخصیت کے آئینے میں ہمارے عکس سب چٹخے ہوئے ہیں
ہمارے جسم کے بوجھل تقاضے ہماری روح تک گہنا چکے ہیں
ہم اپنے قرب کے کمزور دھاگے جھٹک کر توڑ دیں ہمت نہیں ہے
یہ زہراب پی ہی لیں جرات نہیں ہے کبھی سچ بول دیں عادت نہیں ہے

اس منزل سے گزر کر زہرہ نگاہ کے یہاں برسوں کی مسافت پر عورت ایک ایسے موڑ پر آ کھڑی ہوتی ہے جہاں اسکی ذات ایک مصلحت آشنا وجود بن کر زندگی سے یوں مکالمہ کرتی نظر آتی ہے۔

"سمجھوتہ"

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر
چادر میں نے برسوں میں بنی ہے
کہیں بھی سچ کے گل بوٹے نہیں ہیں
کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے
اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے
نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے
اسی کو تان کر بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھل اٹھے گا آنگن
اٹھا لیں گے تو گر جائے گی چلمن

کشور ناہید کا شعری اظہار ایک ایسی کھری اور سچی عورت کا اظہار ہے جسکی آواز مرد کے آگے کبھی نہیں گھگھیاتی۔ کشور ایک نسوانی وجود رکھنے کے باوجود

مردوں کے اس معاشرے میں اپنی ذہنی فعالیت سے اپنا ایک ایسا تشخص قائم کرتی نظر آتی ہے جسے کسی بھی اعتبار کے رد کرنا ممکن نہیں۔ کشور ناہید کے لہجے سے کسی خوابوں میں کھوئی، رومانوی اور جذباتی زندگی کے سحر سے لذت کشید کرتی عورت کی خواب ناک آواز کے بجائے ایک ایسی عورت کی آواز کا اعتماد ابھرتا ہے جو مرد سے رفاقتوں اور محبتوں کی التجا نہیں کرتی بلکہ مرد کو یہ احساس دلاتی نظر آتی ہے کہ حیات کے اس سفر میں اس کی سچی ہماہمی کا لطف اٹھائے بغیر خود مرد کا وجود ناآسودہ و تشنہ ہے کشور ناہید کی شاعری میں جدید حسیت کا اظہار کرتی عورت سماج میں ایک ایسے تجربے کی انتہا تک پہنچی نظر آتی ہے جو اسے ایک طویل عرصے پر پھیلی جدوجہد کے نتیجے میں ایک ایسے مقام پر لے آیا ہے جہاں سے اب اسے خود اپنے وجود کی روشنی میں اپنی اگلی راہوں کا تعین کرنا سہل ہو جائے گا اس لئے کہ کشور کے یہاں افتادہ و بے حال عورت کے بجائے ایک ایسی بھرپور عورت مکالمہ کرتی نظر آتی ہے جسے زندگی کے نت نئے تجربات اور انکشافات نے حوصلہ و اعتماد دے کر اک نئی شان سے مسکرانا سکھا دیا ہے۔

خلا پہن کر ہوا میں پر مارنا
زندگی ہوتی
تو میرا آشیانہ سب سے اونچا ہوتا
بل کھاتی سڑکوں، گھنے جنگلوں، بہتے دریاؤں اور اترتی
آبشاروں میں سے کوئی بھی تو تم سے رشتہ نہیں بناتا ہے
تمہاری دھار چاقو کی سی تھی
مگر صرف چاقو کا دستہ بن کر
تم نے خود ہی پناہوں کے پردے چاک کئے
تمہاری زندگی کی ہر صبح، سورج کی منڈی میں بے بھاؤ اٹھا لی گئی
تمہیں پرمٹ پر جتنی آزادی ملتی ہے
اسکا راشن تو ایک صبح کیلئے بھی ناکافی ہوتا ہے

میں اب سمندر کی سب سے اونچی لہر میں خود کو تحلیل کر کے
ریت بن کر بکھر چکی ہوں
ساحل سمندر، میری وسعت
اور آنسوؤں کی طرح نمکین پانی، میری حیات ہے
آگ لگے ہیروں کے ساتھ تڑپتی چڑیا
میرے سینے پر آگرتی ہے
ہوا اور تیز چلتی ہے
رات اور گہری ہوتی ہے
محبت مرنے کی قیمت دے کر حاصل ہوتی ہے

اردو شاعری میں فہمیدہ ریاض کی آواز ایک ایسی آواز کی حیثیت سے یاد کی جائے گی جس نے اس حوصلے کو اپنایا جو کسی استحصالی نظام کے خنجر تلے بریدہ ہوتے ہوئے گلے سے ایک چیخ کی مانند نکل پڑتا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے "پتھر کی زبان" سے "بدن دریدہ" کی شاعری تک آتے آتے عورت کے تجربات کی سچائیوں کو انتہائی بے باک اظہار سے مربوط کرکے بہت سے ان لکھے اور ان کہے ممنوعہ جذبوں کے حوالے سے ایک ایسی فضا مرتب کر دی جس میں عورت ایک سراپا احتجاج بن کر ابھری یہ احتجاج مرد کی جملہ حیثیتوں سے مغلوب اس روایتی معاشرے کے اس رویئے کے خلاف ہے جس میں عورت کے احساس اور جذبات کی خالصیت کو مذہب، سماج، قانون اور اخلاقی قدروں کے نام پر ہمیشہ جھٹلایا جاتا رہا ہے اور یہی دوغلہ رویہ عورت کو اپنے وجود کے مکمل اوراک سے محروم رکھے ہوئے ہے۔ فہمیدہ نے اسی دھتکاری ہوئی عورت کو اس کی ذات کی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ از سر نو تلاش کر لیا ہے اور اسکے جسمانی اور روحانی تقاضوں کو اس طرح ایک کلیت میں پیش کیا ہے کہ عورت کہیں آدمی دکھائی نہیں دیتی۔ میگھ دوت، باکرہ، ابد، اقلیما لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا، زبانوں کا بوسہ، زن ناپاک، چادر اور چار دیواری ایک ایسی ہی عورت کی آوازیں ہیں جو اپنے وجود میں ایک مکمل عورت ہے اور اپنے بھرپور اظہار پر مصر۔

پروین فنا سید کی شاعری میں عورت اپنے روایتی کردار میں وفا اور عشق کی یکطرفہ علامت بن کر ابھرتی ہے اگرچہ اسکی آواز میں کہیں کہیں مرد کے مروجہ رویوں کے خلاف غصہ کا اظہار بھی موجود ہے مگر یہ اظہار محض بیان اور ذکر تک ہی محدود رہ کر، کسی کسک اور تڑپ کی نشاندہی تو ضرور کرتا رہتا ہے مگر احتجاج بن کر بلند نہیں ہوتا۔ یوں پروین فنا سید کے ہاں جدید عورت کی حسیت کے وہ تجربے نظر آتے ہیں جن کے تناظر میں تشکیل پاتی اسکی نئی شخصیت کے خدوخال، اسی روایتی عورت سے ملتے جلتے ہیں جو اپنے دکھوں اور کرب کی چادر میں ہر روز اک نیا پیوند لگا لیتی ہے اور پھر اسی چادر میں اپنے وجود کو چھپائے رکھتی ہے۔

پروین شاکر نے "خوشبو" کے قلم سے ایک ایسے وجود کی صورت گری کی ہے جسکی رگوں میں مرد اور عورت کی سچی رفاقتوں اور محبتوں کی ازلی تشنگی، خواہش بن کر دوڑ رہی ہے --- پھر اس محبت کی تجسیم سے لے کر، اسکی تہذیب اور اسکے گوناگوں رنگوں کے بیانات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سپردگی اور ہم وشتگی کی خواہش، عورت کے وجود کا وہ فطری جذبہ ہے جسے وہ کبھی بھی جھٹلا نہیں سکتی۔ مگر پھر پروین شاکر کے یہاں بھی "خوشبو" سے "خود کلامی" اور انکار تک پہنچتے پہنچتے عورت اپنی ذات کے سفر میں درپیش انہیں پر پیچ اور پرخار راہوں سے اپنا دامن تار تار کرتی نظر آتی ہے جو ان کی پیشرو شاعرات کے تجربات میں، زندگی کی صداقتوں کے طور پر در آئی تھیں۔ پروین کے یہاں عورت کا نسوانی وجود جو ابتداء میں سپردگی اور وفا پرستی کا مظہر بن کر سر جھکاتا نظر آتا ہے اور ہر لحہ بکھرنے، ٹوٹنے اور مجروح ہونے کے عمل سے گزرتا تھا۔ "خود کلامی" اور "انکار" کی شاعری تک آتے آتے ایک ایسے روپ میں بدلتا نظر آتا ہے جو جسم و جاں کی اکائی کو سمیٹے رہنے کے فن سے آگاہ ہو چکا ہو۔ پروین نے محبت کے جذبے کی تہذیب کرتے ہوئے اپنی تمام تر سپردگیوں کے باوجود، ایک ایسی عورت کو اپنے اندر تلاش کر لیا ہے جو جھوٹی رفاقتوں کے بہلاوں کے مسلسل اقرار سے اپنے آپ کو کمزور کرنے کے بجائے اب اپنی کھلی آنکھوں سے زندگی کی تمام تر سفاکیوں کو پرکھتی اور جانچتی ہے اور اسی پرکھ اور جانچ کو

میزان بنا کر اپنے حوصلہ انکار سے بھرپور کام لیتی ہے کیونکہ یہی حوصلہ انکار اسکے تشخص کی بھرپور علامت ہے۔

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہئے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں
میں اک نوزائیدہ چڑیا ہوں لیکن
پرانا باز مجھ سے ڈر رہا ہے

خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک میرے وجود کے اندر اتر نہ جائے
میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لا جواب کر دے گا

عذرا عباس نے اپنی طویل نثری نظم "نیند کی مسافتیں" میں ایک خواب دیکھتی اور اس خواب کی معنویت سے الجھتی عورت کی ذہنی کیفیتوں کو رقم کرنے کے بعد اپنے دوسرے مجموعے "میز پر رکھے ہاتھ" تک آتے آتے جدید عورت کی حسیت کا اظہار کرتے ہوئے ایک ایسی لا حاصلی کی طرف اشارہ کیا ہے جو اسکی زندگی کے نئے حوالوں کے باوجود، اسکے تجربے کا حصہ بنتی چلی جا رہی ہے۔

میرا جسم کانٹوں سے الجھ گیا ہے
وہ کشتی جو میں نے اپنے ہاتھوں کو زخمی کر کے سالہا سال کی طوالت سے تیار کی تھی موجوں کے بے رحم حوالوں میں الجھ گئی ہے۔ زمین کا راستہ کس سرنگ سے گزرتا ہے۔ میرے بازوؤں میں سکت پیدا ہو جائے پھر ایک بار پانیوں کا رخ بدل جائے تو میں اس دن کے روشن اشارے پر مڑ جاؤں جہاں میں نے تجھ سے پہلی بار معاہدہ کیا تھا۔

فاطمہ حسن نے اسی لا حاصلی، کا احساس دلاتے ہوئے لکھا۔
باتوں کے بہلاوؤں میں مجھ کو کیوں الجھاتے ہو --- اپنے آپ کو کب

دیکھا ہے --- اوروں کو پہچانو گے؟

لمحوں میں سب جینے والے لمحوں میں کھو جاتے ہیں۔

عورت کے اس لا حاصلی کے احساس کو ایک تاریخی تناظر کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اندازہ ہوگا کہ انسانی معاشرے میں ذہنی سطح پر کوئی تبدیلی خارج کے اثرات کے تحت نہیں آتی بلکہ بنیادی طور پر ان رویوں کی بتدریج تبدیلی سے خودبخود پیدا ہوتی ہے جو ایک مسلسل عمل کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں ---- پاکستان معاشرہ اپنے مخصوص مزاج کی بنیادی خصوصیات میں آج بھی وہی ہے جو کئی دہائیاں قبل تھا اور سماجی معاشرتی، علمی اور فکری سطح پر اگر کوئی تبدیلی آئی بھی ہے تو وہ اتنی معمولی ہے کہ بحیثیت مجموعی کوئی انقلابی رویہ پیدا کرنے سے بہر طور قاصر ہے اس لئے اگر عورت کا تجربہ مسلسل اسی پس منظر میں سامنے آرہا ہے جو ایک مروجہ پس منظر رہ چکا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہوا ہے کہ جیسے جیسے عورت اظہار کی منزلیں طے کرتی جا رہی ہے اپنے دکھوں اور کرب کی تازہ تر سچائیوں کے ساتھ پیش کرنے میں بے باک سے بے باک تر ہوتی جا رہی ہے اور حجابات کی وہ سیاہیاں مٹتی جا رہی ہیں جو اسکے وجود اور اسکی ذات کی اصلیت کو گہنائے رکھتی تھیں۔

ہماری ایک اور خوش فکر اور خوش انداز شاعرہ عشرت آفریں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کنج پیلے پھولوں کا میں عورت کی اس آواز کو زنجیر کہا ہے جو مختلف انسانی رشتوں کو معانی عطا کرتی ہے اس آواز نے اپنی شاعری کا انتساب اپنے باپ کے بجائے اس ماں کے نام لکھا ہے جو "جدید عورت" کے با اعتماد اور حوصلہ مند وجود کا ایک معنی خیز استعارہ ہے۔

میرا قد میرے باپ سے اونچا نکلا
اور میری ماں جیت گئی

آگے جا کر یہی آواز اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہے۔

میرا تعارف جو تم سمجھتے ہو وہ نہیں ہے

میں اپنی گلیوں کی دھوپ میں کھیل کر بڑھی ہوں
میں خواب کی عمر میں بھی حالات سے بڑی ہوں
میں اپنے آبا کی قبر پر کھلنے والی وہ خوشنما کلی ہوں
جو اپنے ہونے کے جرم میں ہر سزا کو ہنس ہنس کے کاٹتی ہے
کچی عمروں میں بھی اکیلی رہی
میں سدا اپنی ہی سہیلی رہی
لاکھ پتھر ہوں مگر لڑکی ہوں
پھول ہی پھول ہیں اندر میرے
مری انا' مرا معیار فن نہ ہو کیونکر
یہ فن ملا ہے وراثت میں اپنی ماں سے مجھے

عشرت آفریں نے اپنی ایک اور مکمل نظم "غیر اہم فرد کیلئے" میں برصغیر کی افلاک زدہ دیہاتی عورت کے شب و روز کی مشقتوں کو بے حد خوبصورتی سے نظم کرتے ہوئے' معاشرے کے استحصالی عناصر کے ہاتھوں زخم کھائی ہوئی مظلوم عورت کے چہرے کو اس طرح آئینہ دکھایا ہے کہ اس آئینے میں اک پورے نظام کے خدوخال روشن ہونے لگتے ہیں اور اسی طرح ان کی غزلوں کے اشعار میں اس کا اظہار اس طرح ہوا ہے۔

لڑکیاں ماؤں جیسا مقدر کیوں رکھتی ہیں
تن صحرا اور آنکھ سمندر کیوں رکھتی ہیں
عورتیں اپنے دکھ کی وراثت کس کو دیں گی
صندوقوں میں بند یہ زیور کیوں رکھتی ہیں

سارہ شگفتہ کی کتاب "آنکھیں" جو ان کی نثری نظموں کا مجموعہ ہے ایک ایسی ہی عورت کی داستان حیات ہے جو زندگی کی سفاک ترین منافقتوں میں گھری اپنے باطن میں کھلی دکھوں سے اپنے درد و کرب کو رقم کرنے کی کوشش میں' اپنے لہجے کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ سارہ شگفتہ کا یہ نا مکمل اظہار ایک تخلیقی

کرب سے وابستہ ہو کر' ایک خاص حوالے سے سامنے آیا ہے مگر اس نا مکمل اظہار کے پیچھے ہمارے معاشرے کی بے شمار کچلی ہوئی مظلوم و بے بس عورتوں کی آنکھیں' خون کے آنسو روتی ہیں سارہ کی آنکھیں' انہیں آنکھوں کا استعارہ بن کر زندگی کی بے معنویت پر اسطرح نوحہ کناں ہیں۔

"ہر قدم زنجیر معلوم ہو رہا ہے اور میرا دل تہہ کر کے رکھ دیا گیا ہے شور مجھے لہولہاں کر رہا ہے میں اپنی قید کاٹ رہی ہوں اور اس قید میں کبھی ہاتھ کاٹ کر پھینک دیتی ہوں' کبھی آواز کاٹ کاٹ کر پھینک رہی ہوں۔ میرا دل دلدل میں رہنے والا کیڑا ہے اور میں قبر سے دھتکاری ہوئی لاش' سڑاند ہی سڑاند سے میری آنکھوں کا ذائقہ بد روح ہو رہا ہے اور میں انسان کی پہلی اور آخری غلطی پر دم ہلائے بھونکتی چلی جا رہی ہوں۔

تنویر انجم اپنے پہلے مجموعہ کلام "انوکھی لہریں" میں میں اپنی نظم نا یافت میں اس اظہار کے بعد کہ۔

"تم نے سوچا بہت' کوئی مل جائے گا
اور بدن پر چمکتے ہوئے خواب سی ایک صورت کہیں پر نظر آئے گی۔
میں نے سمجھا یہی --- رات، دن کی سبھی محنتوں کا بدلہ
تم مجھے جان کر چوم لو گے کبھی
مگر زندگی یوں گزرتی رہی عمر بھر کے سفر کی تھکاوٹ
بدن میں اترنے لگی
اور مجبوریوں کے نشیمن میں ہم اپنے خوابوں کے پتے گراتے رہے۔

جب اپنے دوسرے مجموعے "سفر اور قید میں نظمیں" میں نظم "دل کے ترازو میں" اپنے تجربات کو رقم کرتی نظر آتی ہیں تو لاحاصلی کا وہی اولین احساس یہاں بھی کار فرما نظر آتا ہے اور پھر اس احساس سے پیدا ہونے والی محرومی' ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کسک بن کر' دل میں چبھنے لگتی ہے۔

"مجھے تیز دھوپ میں کھڑا کر کے' خود دیوار کے سائے میں بیٹھتے ہوئے تم

بہت معصوم تھے"۔

اگر تم اتنے معصوم نہ ہوتے تو تمہیں قتل کیا جا سکتا تھا تم نے اپنی کہانی سنا دی اور میری محرومیاں سننے سے پہلے کہیں دور چلے گئے۔

پاکستانی عورت کے وجود کی آسودگیوں کی مختلف جہات کی ہماری شاعرات مختلف حوالوں سے مستقل لکھ رہی ہیں اس اظہار میں کبھی زندگی رومانوی اور جذباتی پہلو خیابان ہوتا نظر آتا ہے اور کبھی اسکی ذہنی اور باطنی زندگی کی تشنگی اور کبھی یہ احساس کہ عورت کے وجود میں نمو کی اس خواہش کو ابھی وہ سیرابی میسر نہیں جو اسکی زرخیزیوں کو کمال تک پہنچا کر' اسے ایک ایسے شجر سایہ دار میں بدل سکے جسکی چھاؤں حیات انسانی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

یہ جھجک جو میری نمو میں ہے
جو قد آوری سے عناد ہے
مری تربیت کا قصور ہے
مری پرورش کا فساد ہے
ابھی اگ رہی ہوں لحد سے میں
مری جڑ میں خوف کی کھاد ہے

(شاعرہ نسیم سید - مجموعہ: آدھی گواہی)

اور یہ خوف کی کھاد کیا ہے۔ در اصل اس ناپائیدار ہم رشتگی کا احساس ہے جو عورت کی ذات کے دانے دانے کو محض کچے دھاگوں میں پرویا ہوا دیکھنے والوں کی مصلحت اندیشیوں اور منافقتوں کا مظہر ہے جو اسکے بکھرے وجود کو سمیٹنے کے ہنر سے آج تک نا آشنا ہیں۔

"کچے دھاگے"

نسیم سید

عورت اپنی ذات کو دانہ دانہ

ایک ہی ہستی کے دھاگے میں گوندھے
گوندھ کے سمجھے
اسکی ذات کی سب بکھری کڑیاں زنجیر ہوئیں
دھاگے کی بس ایک گرہ کے بل پر
اپنی ہستی کی تکمیل کے امکانات پرو دے
کچے دھاگے
گرہ لگا دینے سے کب مضبوط ہوئے
جب چاہیں جس طرح سے چاہیں
پھر سے اس تسبیح کو توڑ کے
ذات کو دانہ دانہ کر دیں

شبنم شکیل اور یاسمین حمید کا نام بھی ایسی ہی شاعرات میں آتا ہے جنہوں نے عورت ہونے کے تجربے کو مخصوص معاشرتی اور سماجی تناظر میں نئی حسیت کے ساتھ لکھا ہے۔ شبنم شکیل کی ایک نظم کا عنوان ہے "عدل دریا"

مری تار تار محبتیں
مری دل نگار محبتیں
مری بے وقار محبتیں
مری بار بار محبتیں
سبھی مستعار محبتیں
جو اجڑ سکیں، نہ پنپ سکیں

سر شاخ دل نہ سجا کبھی، کوئی لمحہ کھلتے گلاب سا
سر باک جاں نہ رقم ہوا، کوئی سانحہ، کوئی المیہ
کسی قید میں، کسی جبر میں، رہین کور چشم بصارتیں
سو کتاب جاں کی عبارتیں، نہ سیہ ہوئیں نہ سفید ہی
وہی ایک رنگ تھا سرمئی، وہی جو پیرہن کا ہے شکوہ

یونہی عمر ساری گزر گئی

یاسمین حمید اسی باب میں شکوہ سنج ہوتے ہوئے اظہار کرتی ہیں۔

تو بدل کر کبھی انداز پذیرائی کا
امتحان لے مرے احساس کی بینائی کا
آئی جب اسکے مقابل تو نیا بھید کھلا
مجھ کو اندازہ نہ تھا' اپنی توانائی کا
اس نے بس سطح پر چلنے کا سلیقہ سیکھا
اور سمجھنا تو مجھے' کام تھا گہرائی کا

میں اپنی ذات کے محدود چنگل سے نکل جاؤں
اگر وسعت کی پروردہ ہوں' جنگل سے نکل جاؤں
میں بجلی ہوں' شرارہ ہوں' اگر بادل کے اندر ہوں
اور اک رحمت کا قطرہ ہوں' جو بادل سے نکل جاؤں

محبتوں اور رفاقتوں کی میرے معنویت اور یہ بے عزتی جو بار بار اور مستقل عورت کے حصے میں آتی چلی جا رہی ہے زندگی کے بارے میں اسکی باطنی سچائیوں' انکشافات پر مشتمل ہے اور یہی اس عورت کا تعارف ہے جو ان تمام تر ذہنی فعالیت کے ساتھ آج انسانی معاشرے کی ایک اہم اکائی ہے۔

نسرین انجم بھٹی' وضاحت نسیم' یاسمین' حمید' منصور احمد' ناہید قاسمی اور نوشی گیلانی جدید عہد کی ایسی ہی نا آسودہ عورت کی آوازیں ہیں جو گھٹن اور جبر کی فضا سے باہر نکل کر اب اپنی ذات کی تہہ داریوں کے ساتھ بھرپور اظہار کی جانب بڑھ رہی ہیں۔

اردو افسانہ 'کرب آگہی' اور خواتین افسانہ نگار

ام عمارہ

موسیقی کے بارے میں یہ کلیہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس جہاں آب و گل میں کچھ بھی نہیں تھا تو بھی زندگی تھی جب یہی ہوا پتوں سے گزرتی تھی تو پتے تالیاں بجاتے تھے اور اس طرح فضاء موسیقی سے گونجتی تھی۔ ایسا کب تھا؟ کیسے تھا؟ کہاں تھا؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن یہ ہمارے تجربے کی بات ہے کہ پیپل کے پتوں سے جب ہوا گزرتی تھی تو ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے پتے تالیاں بجاتے ہیں اور سوکھے پتوں سے باجے کی آواز آتی ہے۔ پتوں کی جھنجھناہٹ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی تھی کیوں اور کیسے۔

یقیناً یہی موسیقی ہے اور اس کے بارے میں یہ کلیہ بالکل صحیح ہے کہ موسیقی ابتدائے آفرینش سے موجود تھی ہوا میں جہاں طوفان ہیں وہاں گیت بھی ہیں اور گیت ہی سنگیت ہے۔

قصے کہانیاں انسانی جبلت کے تقاضے ہیں انسان کا وجود کہانی ہے اور کہنا سننا ہی انسانی شعور ہے۔ شاید کہانی نے اس وقت جنم لے لیا تھا جب زبان سے یہ نکلا کہ "اللہ ایک ہے پاک اور بے عیب ہے اس جیسا اور کوئی نہیں اور اگر کوئی اس کی ہمسری کا دعوی کرے تو کہیں فرعون ہے اور کہیں نمرود ہے وہ بے نیاز ہے اور دنیا نیاز مند' نیاز مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیشہ سر جھکائے رکھو۔ کیوں اور کیسے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خدائے بزرگ و برتر کی ہمسری کا دعوی کرنے والے مرد تھے کہ انہیں صنف قوی ہونے کا زعم تھا۔ طاقت کا اشتہار ہو تو دیو کرے کو ہتھیلی پر رکھے نظر آتا ہے کہیں پولیس' کہیں رستم' داستانیں ہی داستانیں' رنگ و نور کی سبھا ہے تو پریوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر ہی افضل ہے کہیں غیض و غضب' کہیں رنگ و نور' پریاں اندر کے رنگ محل کی زیبائش و آرائش دل بہلاوے کا سامان تھیں۔

لیکن کہیں یہی عورت ہیلن آف ٹرائے ہے تو کہیں جون آف آرک۔ کہیں سیتا تو کہیں جھانسی کی رانی اور کبھی محبت یا مجبوری کے ہاتھوں جل مرنے والی ستی، کبھی رنگ منڈی کا کھلونا کبھی موم کی مریم، اور مرد --- وہ تو رزم و بزم کا ہیرو ہے۔ لیکن کبھی عورت کے ہاتھوں میں کھیلنے والا کھلونا، کہ شبلی کو بھی جہانگیر و نور جہاں لکھنے کا شوق ہوا تو فرمایا کرتی تھی جہانگیر کے پردے میں شہنشاہ زمن۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ نور جہاں جہانگیر کے پردے میں کیوں۔ رضیہ سلطانہ کے ساتھ ملک یاقوت کا دم چھلا کیوں۔ ملکہ وکٹوریہ کو اپنی مصمم عقل و فہم کے پرچار کے لئے عقیل و فہیم لوگوں کا گروہ چاہئے تھا کیوں بھلا۔؟

اس لئے کہ وہ زمانہ گزر گیا جب عورتیں خاندانوں کی سربراہ ہوتی تھیں انہیں پتہ ہوتا تھا کہ ان بچوں کے باپ کون ہیں اور ڈھیروں باپوں کے درمیان پلنے والے بچے ماں کے بچے بھی تھے اور باپ کے بھی کہ عورت زمین کی طرح ہے۔ جس طرح دھرتی سب کی ماں ہے اسی طرح ماں کی کوکھ سے نکلنے والے بچوں کی ماں بھی ایک ہوتی ہے اور جس طرح زمین میں ڈالا جانے والا بیج مختلف موسم میں مختلف ہوتے ہیں رنگ و روپ، حسن و قبیح، زہرہ، تریاق کچھ بھی ہوں سب کی ماں دھرتی ہے۔ اسی طرح ماؤں کے بچے صرف بچے ہوتے ہیں ان کے اپنے بچے نہ وہ حرامی ہوتے ہیں اور نہ حلالی

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں پرانے زمانے میں لوٹ جانا چاہئے لیکن دودھ کے ناطے تو گائے بھی پوجا کے لائق سمجھی گئی پھر عورت کے ساتھ مخاصمت کیوں؟ عورت ایک طرف دیوی بنی تو دوسری طرف وحشیا، ہمارے ادب میں عورت کو خاتون خانہ بنانے کا شوق ہمارے شعراء کو بہت تھا سبھا کی پری کا روپ اس لئے برا تھا کہ وہاں انکی پہچان ختم ہو جانے کا خدشہ تھا یا انکی مردانگی کو ٹھیس لگتی تھی یہ بیک وقت بیوی بہن اور ماں سب کچھ تھی اسی لئے مشرق کی تقدیس کے ثناء خواں دوہائی دینے لگتے ہیں حدیں مقرر کرتے ہیں۔ وقت کا احساس دلاتے ہیں۔ زمانے کی دہائی دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اسے اس لائق بنانا ہی نہیں چاہتے تھے کہ وہ زمانے کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ سکے۔ ان کے خیال میں مرد کی پسلی سے پیدا ہونے والی عورت صرف موم کی ناک یا دل بہلاوے کا سامان تھی لیکن عورت اپنے ساتھ جہاں مٹی کی زرخیزی، نرمی اور گداز لائی وہیں اپنی فطرت میں چٹان کی سختی ارادے کی مضبوطی اور ایسی انفرادیت رکھتی ہے جو ناقابل شکست ہے۔ وہ تمام رکاوٹ کے باوجود اپنی فکر کی جولانی کے لئے نئے نئے راستے تلاش کرتی ہے۔ عورت تو پانی ہے جو طوفان بھی ہے اور زندگی بھی وہ تخلیق کا منبع ہے اور پانی کی طرح اپنی راہوں کی خود امین ہے۔

اپنی تخلیق کے بعد اس دنیا کی تخلیق سے گم ہو جانے والی عورت اپنی بصیرت سے زندگی کے ہر میدان میں قدم رکھنے لگی مرد کی مددگار اسکی نصف بہتر، یہاں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ نصف بہتر بننے میں کوئی خرابی نہیں کہ مرد بھی ادھورا ہے اور عورت بھی تخلیق کے عمل کیلئے دونوں کا اپنا اپنا کردار ہے مردوں سے عورت مخاصمت نہیں رکھ سکتی نہ ہی وہ رکھتی ہے کہ وہ اسکا دوست ہے ساتھی ہے محبوب ہے بھائی ہے باپ ہے اور آشنا بھی ہے۔ لیکن میدان عمل میں صرف مرد بالا و برتر نہیں ہے عورتیں شاید پست قامت ہوں تو ہوں۔ پست ہمت بالکل نہیں ہوتیں۔ بلکہ انکی ہمت کی بلندی سے آدمی کا مرتبہ بھی بلند رہتا ہے۔

آدمی کو انسان بنانے والی عورت ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس کے ساز سے زندگی کا سوز دروں ہے جس کی خاک پا ثریا سے برتر ہے۔ جس کے شعلے سے افلاطون جیسا شرارہ جھڑ سکتا ہے وہ اتنی مجبور ہے کہ خود افلاطون نہیں بن سکتی اقبال کی تمام کشادہ دلی عورت کے باب میں اکبر کی قدامت پرستی کی ہم نوا ہے۔

عورت افلاطون تو ہے لیکن معاشرہ چونکہ ہر زمانے میں مردوں کا رہا ہے اور دنیا طاقت کی ہے مردوں کو صنف قوی کہا جاتا ہے۔ اس دن ہم عصمت کا مضمون ایک بات پڑھ رہے تھے، عصمت چغتائی نے اپنے اس مضمون میں کئی جگہ مغربی عورت کا مشرقی عورت سے مقابلہ کیا ہے اور "اپنے اس تقابلی مطالعے میں انہوں نے مغرب کی عورت کی ان سہولتوں کا ذکر کیا ہے جو مشرقی عورت کو نصیب نہیں تھی۔ سچ

تو یہ ہے کہ عورت مغرب کی تھی یا مشرق کی اسے اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے۔ جارج ایلینٹ مغرب ہی کی بیٹی ہے لیکن اسے مردوں جیسا نام رکھنا پڑا کہ معاشرہ مردوں کا تھا۔

عورت مجہول یا بے بس نہیں ہے اور صرف اس لئے کہ جنس مخالف جسمانی طور پر مضبوط ہے اپنے آپکو اسکے قدموں میں نہیں ڈال سکتی ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ بھی اس دنیا کی مخلوق ہے جسکا مرد ہے اور اس دنیا کے تمام حسن و قبیح کی تشکیل میں مرد کے ساتھ اسکی کوششیں مشترک ہیں۔ عورت تو زندگی ہے اور تخلیق کے عمل میں مرد کی شریک ہے۔ عورت مرد سے نبرد آزما نہیں ہے وہ تو دوزخ میں شبنم کا وہ قطرہ ہے جو دلوں کو ٹھنڈا کرتی ہے اور ایسا شعلہ ہے جو جنت میں بھی آگ لگا سکتی ہے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو عورت بڑے آرام سے قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے تھکتی نہیں۔ وقت یا زمانے کی غلام نہیں پھر کارزار حیات کی اس مخلوق کو کم تر کیسے کہا جاسکتا ہے اس کے بغیر دنیا کی کیا حیثیت بنتی ہے۔ اسے کم ہمت یا کمزور کہہ کر ٹالا بھی نہیں جا سکتا۔

ادب کی دنیا میں ہم جس جہت کی بھی باتیں کریں لکھنے والے مرد کے ساتھ لکھنے والی عورت ہر زمانے میں روشن شہرت کے ساتھ موجود ہے۔ کبھی خنساء تھی کہیں قرۃالعین طاہرہ' ہمارے ہاں جب لوگوں کا نشہ ٹوٹا اور لوگوں نے داستانوں کے پردہ زنگاری کو چاک کیا تو نذیر احمد کان پر قلم رکھ کر عورت کی اصلاح کیلئے ادب کی دنیا میں در آئے۔ ان کے ساتھ ان کے ہم نوا راشد الخیری تھے۔ حالی اسکی چپ کی داد دیتے رہے سچ تو یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ تھا ہی مردوں کا اور آج بھی لوگ یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ بے چاری عورت تھی کیا کرتی۔ حالانکہ عورت قطعی بے بس یا قابل رحم نہیں ہے۔

اردو ادب کے باب میں بھی ایسی بے بسی نہیں ہے مشرق اور مغرب کا جائزہ لیا جائے تو عورت کی جدوجہد ہر جگہ موجود ہے۔ انیسویں صدی کی عورتوں کی تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو جارج ایلیٹ برونٹی سسٹرز اور بہت سی دوسری خواتین

سامنے آتی ہیں۔ معاشرے پر اس حد تک دباؤ تھا کہ جارج ایلیٹ نے مردوں جیسا نام رکھا۔ آخر کیوں صرف اس لئے کہ ابتدائے آفرینش سے اس گوہر نایاب کو قر ذلت کا حصہ سمجھا گیا۔

اردو ادب کی دنیا میں بھی وقت کے آشوب سے جب لوگوں نے سر اٹھایا تو مراۃ العروس، حیات صالحہ جیسی کتابیں سامنے آئیں۔

"مولوی نذیر احمد اپنی تصنیف مراۃ العروس میں نسوانی اخلاقیات، اصلاح نسواں کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔" عورت کے نیک و بدکردار اکبری و اصغری کے روپ میں موجود ہیں لیکن سب کو وہ نیک پروین یا کھونٹے کی گئیاں ہی بناتے نظر آتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ وعظ و نصیحت اور اصلاح کے زور میں وہ اصغری کو ایسا ساربان ضرور دکھاتے ہیں جو بھٹکے ہوئے اونٹ کی ناک میں نکیل ڈال دیتی ہے یعنی اپنے شوہر کامل کو بھٹکنے سے بچالیتی ہے۔ عظمت کے باب میں اپنے سسر محمد فاضل کو صائب رائے سے نوازتی نظر آتی ہے گویا مرد ادیب بھی معاشرے میں عورت کی فہم و فراست کے قائل نظر آتے ہیں اسکے شعور اور علم کی برکت کو مانتے ہیں۔ علم یقیناً برکت ہے جو انسان کے سوئے ہوئے ذہن کے بند دروازے کھول دیتا ہے۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کے ساتھ صرف ایک خاتون ناول نگار رشیدہ انساء اپنی اصلاح انساء لئے کھڑی ہیں۔ نام سے ظاہر ہے کہ اپنی قوم کی اصلاح واقعی منظور ہے۔ انکے بعد لکھنے والے بڑی تعداد میں سامنے آئے دوسری طرف ادب کا میدان خاتون قصہ گوؤں سے خالی نہیں تھا۔ نذر سجاد حیدر، والدہ افضل علی، آمنہ نازل، شائستہ اختر اور بہت سی دوسری خواتین سامنے آچکی تھیں۔ ان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ توہمات کے اندھیرے میں گم یہ قوم صرف چپ کی داد کے لئے نہیں بنی ہے بلکہ اپنا آپ منوانے کیلئے اسے خود مثبت قدم اٹھانا پڑے گا۔

اردو ادب میں عورتوں کی تحریک بیسویں صدی ہی کا تحفہ ہے اوپر جن خواتین لکھنے والیوں کے نام ہم نے گنوائے وہ ہمارے افسانوی ادب کا ہراول دستہ ہیں جو ناموافق حالات میں اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹی رہیں۔ نذیر سجاد حیدر کی طرح

داد تحریر اور طرح دار تصور ان کی استقامت کی گواہی دیتی ہے ہمارا وہ دور جسے ہم اردو افسانوی دنیا کا اہم دور کہتے ہیں اگر اسکی تاریخ کا تعین کریں تو اسکی ابتداء 1920ء کے لگ بھگ ہوتی ہے اور تا حال جاری ہے۔

اس دور میں بہت سارے نام سامنے آئے ایسے نام جنہیں اردو قصہ کہانی کی دنیا میں انقلابی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے ہر ایک اپنے انداز کا بانی ہے۔ ہماری یہ افسانہ نگار خواتین زندگی کے دکھ درد، خوشی نا انصافی غرض ہر شعبے پر گہری نظر رکھتی ہیں اور اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں۔

حجاب امتیاز علی، ڈاکٹر رشید جہاں عصمت چغتائی۔

حجاب کا ذکر جس طرح بھی کیا جائے انکی Fantasy انکے طبقے کی نمائندہ ہے ظالم محبت انکا ناول ہے افسانہ نہیں۔ لیکن افسانے میں بھی یہی انداز ہے۔ زوناش جشن، سیامی بلیاں، ساحلی علاقے، ارغنوں یہ سب علامتیں حجاب کے افسانوں کی ہیں اور انہیں پر ختم ہیں۔ آج بھی کوئی حجاب امتیاز علی کے مکان پر جاکر دیکھے کرسیوں کے گدیلوں پر بلیاں ملیں گی۔

یہ انکا طبقہ تھا اور وہی انکا انداز ہے۔ آگے بڑھئے ڈاکٹر رشید جہاں ہیں بہت بڑا نام آگہی کی دنیا کا ہیرا عبداللہ صاحب اور اعلیٰ بی کی یہ بیٹی نڈر، بیباک، زندگی سے اپنا حصہ چھیننے کیلئے ہر لمحے تیار۔ انہوں نے جس طبقے میں آنکھ کھولی وہ ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ ہی تھا۔ خود لکھنؤ کے اہم ترین کالج میں تعلیم پائی تھی ڈاکٹر تھیں اپنے طبقے کے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف تھیں اس وقت کی حکومت کی دوغلی پالیسی بھی انکی نظر کے سامنے تھی۔ انکی کہانی "انصاف اور قانون" ہے جس میں انہوں نے کھلی آنکھوں سے اس زمانے کے حکمرانوں کو دیکھا اور اپنے ہاں کے دکھ کو سمجھا اور لکھا یہ انکی آگہی کے ویرانے ہی تھے کہ انہوں نے جج رابنسن صاحب کے اس عشق کا تقابلی مطالعہ کر ڈالا جو اسے اپنے ساتھی انگریز افسر کی خوبصورت انگریز بیوی سے تھا مگر قانون کی نگاہ میں تو گناہ گار بھولا گڈریا تھا جس نے ایک بڑھئی کی بیوی سے عشق کیا اور تین سال کی قید بامشقت کی سزا اسی رابنسن کی عدالت سے پائی جھر کی ماری لڑکی

شوہر کے گھر کو آگ لگا دیتی ہے اور خود بھی اسی آگ کی نذر ہو جاتی ہے اور مس فاکس کے استفسار پر کہ رابنسن نے ایسا کیوں کیا۔ رابنسن کا جواب یہ تھا کہ یہ قانون تھا اور انصاف کا تقاضہ یہی تھا تو مس فاکس کا ایک جملہ کہ "رابنسن اگر گپتا صاحب کسی عورت پر مرتے تو کیا تم اس Ics کو بھی یہی سزا دیتے" رشید جہاں کا یہ ایک جملہ ساری کہانی کی جان ہے جانب دار قانون اور انصاف پر ایک ضرب کاری ہے آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ کل بھی یہی ہوا تھا۔

ہماری افسانہ نگار خواتین اس ابتدائی زمانے میں بھی صرف طوطا مینا کی کہانیاں نہیں سناتی تھیں۔ عصمت تو ان سب میں نرالی تھیں۔ انہوں نے جس بے باکی سے بغیر کسی منافقت کے معاشرے کی دکھتی رگوں پر نشتر رکھا۔ اس وقت کے لوگ بغلیں جھانکنے لگے۔

عورت اسکا جسم اسکی گولائی طوائف کے کوٹھے پر ہو یا میاں کے بستر میں جنسی تسکین کا باعث ہے۔ لیکن یہی بات جب کہانی یا کتاب میں چھپ گئی تو فحش نگاری سمجھی گئی اور مقدمے چل پڑے عصمت' کا افسانہ لحاف کس موضوع پر تھا سب ہی جانتے ہیں سارے کا سارا معاشرہ مغرب کا ہو یا مشرق کا آج بھی اسے برا جانتا ہے لیکن ایسے کردار مغربی معاشرے کا حصہ سمجھے جا رہے ہیں ان کے قصے بھی اب کتابوں میں جگہ پاتے ہیں اور کہیں کوئی مقدمہ نہیں چلتا۔ کہ زمانے کے انداز بدلے گئے۔

عصمت کا موضوع صرف لحاف جیسی کہانیاں نہیں عصمت نے تو بہت ہی کھری زندگی گزاری' گفتار اور کردار میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ جو کچھ دیکھا تجربہ کیا لکھ دیا۔ ہمارا معاشرہ کیسا ہے ہماری دنیا میں مرد کا کیا کردار ہے سب ہی جانتے ہیں لیکن اسکی کمزوریوں کی طرف اگر کوئی اشارہ کرے تو وہ سانپ کی طرح پلٹ کر کاٹتا ہے اور اگر نہیں کاٹتا ہے تو بھی عورت کو حقیر جانتا ہے۔ عصمت کی کہانی گیندہ میں خود گیندہ کا کردار۔

وہ چھوٹی سی لڑکی جو افسانہ نگار کے کسی بھائی بھتیجے کی وجہ سے زندگی کے سربستہ رازوں سے واقف ہوتی ہے۔ ماں بنتی ہے۔ تو اس' حقیقت سے بھی واقف ہو

جاتی ہے کہ وہ ماں تو اس بچے کی ہے رہے گی لیکن باپ کے نام کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ معاشرے میں گیندہ کو اس نام سے کوئی عزت نہیں ملے گی اس کا بچہ صرف اس کا بچہ رہے گا۔ بچہ جو اپنی ماں کیلئے نہ حلالی ہوتا ہے اور نہ حرامی صرف اولاد ہے۔

اردو افسانے کو ترقی پسند تحریک سے بڑی تقویت پہنچی لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ دوسری مکتبہ فکر کی خواتین نے افسانوں کی دنیا میں کوئی ہلچل نہیں مچائی، نہیں ایسی بات نہیں ہے بے شمار نام سامنے آئے زندگی کے ہر شعبے سے وابستہ خواتین نے اپنے شعور کی دنیا کھنگالی۔ زندگی کے سربستہ رازوں کو اپنے انداز میں قصہ کہانیوں میں جگہ دی۔

تسنیم سلیم چھتاری، سحاب قزلباش، ممتاز شریں، زاہدہ جبین کو شیلپا، شک، مسز عبدالقادر اور بہت سی دوسری، ان میں تسنیم سلیم چھتاری خالص رومانوی کہانیوں کی خالق اور ہمیشہ دلوں کے تاروں کو چھو لینے والے کردار، ممتاز شیریں جو اپنی نگریا جیسے افسانوی مجموعے کی خالق تھیں۔ بے شک انکا تعلق اس گروہ سے تھا جو ادب برائے ادب کا نعرہ لگاتا تھا۔ علم و فن کو پرکھنے کا جو شعور ان کے ہاں تھا وہ ان کے محاصر مرد نقادوں سے بہت آگے تھا۔ ان کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے حسن عسکری، سلیم احمد، صمد شاہین وغیرہ انکی صلاحیتوں کے آگے ماند تھے۔ بنگلور سے نکلنے والا ادبی رسالہ نیا دور اپنے گروہی فکر و عمل کا ترجمان تھا۔ اور اسکی مدیر ممتاز شیریں تھیں ادبی رسائل کی تاریخ میں نیا دور کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اسکے لکھنے والوں میں سلیم احمد حسن عسکری، جمیل جالبی وغیرہ مشہور لوگ ہیں۔ لیکن ممتاز شیریں ان اہل قلم کے درمیان بہتر نقاد سمجھی گئیں۔ نیا دور آج بھی نکل رہا ہے لیکن وہ شمارے جو ممتاز شیریں کی ادارت میں نکلے انکا انداز ہی کچھ اور تھا وہ صرف پراپیگنڈہ نہیں تھا ادب برائے ادب تھا۔ لیکن نعرے کی حد تک ورنہ وہاں تو جینے کا سلیقہ اور بات کہنے کا ڈھنگ تھا۔ بات رسائل کی چل نکلی ہے تو پھر اردو کے ادبی رسائل میں نقوش اور سنگ میل کا ذکر بھی ضروری ہے۔ نقوش کے ابتدائی شمارے

ہاجرہ مسرور کی ادارت میں نکلے انکے ساتھ احمد ندیم قاسمی تھے ادب کا جو رنگ اس زمانے کے نقوش میں نظر آتا ہے آج کے نقوش میں کہاں ہے یہ بڑا رسالہ ماضی میں ایک عورت کی زیر ادارت نکل رہا تھا۔ جسکی جانفشانی کی تعریف احمد ندیم قاسمی نے نقوش ہی میں چھپنے والے اپنے ایک مضمون میں کی تھی سنگ میل میں خدیجہ مستور موجود تھیں۔ انہوں نے جس انداز میں یہ رسالہ ترتیب دیا بڑے بڑے ادبا اس کو یاد رکھتے ہونگے۔ اشفاق احمد کا معرکتہ الاراء افسانہ گڈریا اسی سنگ میل میں چھپا تھا۔ وہ افسانہ اشفاق احمد کا کارنامہ تھا جسے ہزار میل دور ڈھاکے میں ہم نے سنگ میل کے ذریعے ہی پہنچایا۔ کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اشفاق کی باعث شہرت خدیجہ مستور کی ادارت تھی۔ نہیں بالکل نہیں لیکن بر وقت سامنے لانے اور بڑائی کو راہ دینے کا سہرا تو ایک عورت ہی کے سر ہے۔ اشفاق صاحب کے افسانے کا موضوع 1946ء کے فسادات ہیں اس موضوع پر کرشن چندر بیدی' منٹو' سب ہی نے بڑی پیاری پیاری کہانیاں لکھیں۔ دکھ کی چادر سب کے ذہن کو ڈھانپ رہی تھی عصمت چغتائی کی دھانی بانکیں فسادات پر لکھی جانے والی کہانیوں میں ایک نرالے رنگ کی لافانی کہانی کہی جائے گی۔ اس کہانی میں پوری ایک نسل کی یک جہتی ہے یونٹی نسل کی دوست ہوتی ہے اور جو نفرت کی آگ کی بجائے محبت کی ٹھنڈک میں جیتے ہیں جہاں دشمن کی پہچان ہے۔ جہاں خون دکھ قتل حامد اور سورج کو ختم کر دیتے ہیں لیکن عائشہ اور سورج کی ماں۔ سورج کی بیوی کو سنبھالنے میں لگتی ہیں جو منافرت یا منافقت کی نشانی نہیں بلکہ انکی نئی نسل کی امین ہے جو ہر طرح کے تعصبات سے بالاتر ہے اور ہمیں یہ انکشاف ہوا کہ عصمت ہر حال میں ایک آزاد فکر اور غیر منافقانہ رویئے کی مالک تھیں یہ عصمت ہی تھیں جو ادب کی دنیا میں چار بڑے ناموں میں ایک بڑا نام تھیں جہاں کرشن بیدی منٹو تھے تو عصمت بھی اس اس گروہ کا جز تھیں جنکے بغیر افسانہ نگاروں کی یہ ٹولی مکمل نہیں ہوتی تھی اوپر کے سارے ادیب اگر انسانیت کا پرچار کر رہے تھے تو عصمت کے ہاں بھی یہی سب کچھ تھا بلکہ بڑھ چڑھ کر تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اردو کی خواتین افسانہ نگار جس غیر محسوس طریقے سے ایک ایک میدان علم و

ادب میں اترتی چلی آرہی ہیں اور اپنا آپ منوا رہی ہیں اس سلسلے کو کہاں سے شروع کیا جائے۔ نذیر احمد کے وقت کی رشیدۃ انساء بیگم سے ہوتے ہوئے جب ہم ترقی پسندوں تک پہنچتے ہیں تو اردو افسانے کا سورج بڑے آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ پریم چند کا ڈنکا بج رہا تھا۔ عصمت، صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر رشید جہاں، شائستہ اختر سہروردی جہاں آرا چودھری، زہرہ جبین، طاہرہ دیوی شیرازی مسز عبدالقادر، جیسی لکھنے والیاں سامنے آرہی تھیں۔ یہ لکھنے والیاں عورت یا مرد کے خانے میں نہیں بانٹی جا سکتی تھیں بلکہ ادیب تھیں اور اپنے شعور اور اپنی آگہی کے ہاتھوں خود اپنے لئے جگہ بنا رہی تھیں۔ عالمی ادب کا احاطہ کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں سچی بات تو یہ ہے کہ ہماری لکھنے والیوں کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ اگر صرف نام گنوانے بیٹھ جائیں تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں گے۔ یہ وہ نام ہیں جنہیں خواتین ادیبائیں کہہ کر ایک خانے میں نہیں ڈالا جا سکتا یہ تو وہ ہیں جنکے بغیر اردو افسانوں ادب کا جائزہ لیا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ سچ مچ اردو افسانے کا روشن سورج ہیں۔ کوشیلیا اشک، سدلا دیوی، ہاجرہ مسرور، جیلہ ہاشمی، سائرہ ہاشمی، فرخندہ لودھی، الطاف فاطمہ، شہناز پروین، اختر جمال، عذرا اصغر، نکہت مرزا، عطیہ سید، نیلم احمد بشیر، نیلوفر اقبال، خالدہ حسین وغیرہ کس کس کا نام ہم لکھیں یہ تو وہ نام ہیں جنکے وجود سے ہمارے افسانوی ادب کی ہر جہت منور ہے۔ قرۃ العین ہوں یا خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد ہوں یا شکیلہ رفیق، زاہدہ حنا ہوں یا حسانہ انیس، زندگی کا کون سا موضوع ہے جس پر خواتین نے کامیابی کے ساتھ قلم نہیں اٹھایا۔

جیل کی فضا میں نیکی نہیں پلتی ہر طرف پریشانی، بے بسی، موت، پھانسی، بے حسی، جرائم اور سزائیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس مسموم فضا میں سنتری جواب میں آواز لگاتا ہے سب اچھا ہے۔ یہ خدیجہ مستور کی ایک صفحہ کی کہانی ہے جو ہمیشہ ایسے وقت یاد آتی ہے جب بادسموم کے جھونکے ہمارے گھر سے لیکر ہماری زندگی کو جھلسا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ سب اچھا ہے اور اسی لئے استبداد کی یہ دنیا ہمیں ایک جیل لگتی ہے جہاں ہمارا دم گھٹتا ہے جہاں خون ہے آگ ہے برف اور ازلی

و ابدی بھوک ہے استحصال ہے جس سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ لیکن اس دنیا کے ارباب حل و عقد کے نزدیک سب اچھا ہے۔ یہ لافانی کہانی ایک عورت نے لکھی اب آپ ہی بتائیں آگہی کس کو کہتے ہیں۔ آج جس ادبی رسالے کو اٹھائیں لکھنے والوں کے درمیان لکھنے والیاں بڑے آن بان سے ہر طرف موجود ہیں بلکہ کبھی کبھی تو ہر شئے پر چھائی نظر آتی ہیں۔

امرتا پریتم، بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر جیلانی بانو، واجدہ تبسم، آمنہ ابوالحسن، جیلانی بانو، زاہد حنا، عفراء بخاری، عفت موہانی، جس طرف نگاہ کیجئے ہر جگہ زندگی موجود ہے کہیں بھی بے خبری نہیں ہے آنکھیں کھول کر دیکھا اور کان کھول کے سنا جا رہا ہے۔ بزم جہاں کے افسانے لکھے جا رہے ہیں اور اس میدان میں عورت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔

بات جانبداری کی نہیں ہے یہ کھلی حقیقت ہے تقسیم کے موضوع پر ڈاکٹر احسن فاروقی جیسے صاحب طرز ادیب نے آبلہ دل کا لکھا اور پھر کئی جلدوں میں اس کہانی کو آگے بڑھایا لیکن کہانی آگے بڑھتے بڑھتے بے مزہ ہو گئی۔ حالانکہ وہاں سچائی ہے دکھ ہے حقائق ہیں لیکن وہاں وہ سلیقہ نہیں ہے جو ان کے ناول شام اودھ میں ہے۔ انہوں نے سنگم میں لکھا لیکن اس میں وہ بات کہاں ہے جو قرۃ العین حیدر کے آگ کے دریا میں ہے ہمارا مطلب قطعی طور پر ڈاکٹر احسن فاروقی کو کمتر بیان کرنا نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کا فن سرا سر ارتقاء ہے وہ میرے بھی صنم خانے اور سفینہ غم دل لے کر آگے بڑھیں تو جاگیردارانہ نظام کی نمائندہ نظر آتی تھیں۔ اور عصمت چغتائی نے ان پر اپنا مضمون لکھا "پوم پوم ڈارلنگ" لیکن یہی پوم پوم ڈارلنگ جب آگ کے درمیان سے گزرتی ہوئی آخر شب کے ہم سفر، گردش رنگ چمن تک پہنچتی ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ صاحب طرز ادیب ایسے ہوتے اور ادب کے میدان میں آگہی کی روشن راہیں کسی خاص صنف کی میراث نہیں ہے۔ جو قلم پکڑے گا۔ سچائی سے اپنا ماضی الضمیر بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہے وہی زمانے کا ترجمان ہے اور وقت کی مار اسکے لئے نہیں وقت اسکے قبضے میں ہوتا

جیسے قرۃ العین حیدر کو اپنے قلم پر قدرت حاصل ہے جس نے اپنے وقت کا حساب رکھا اور اردو ہی نہیں بلکہ دنیاوی ادب میں بڑا نام پایا ناول کی بات تو بر سبیل تذکرہ ہمارے درمیان آگئی۔ قرۃالعین حیدر کے افسانے نظارہ درمیان ہے۔ سیتا میری' جلا وطن اگلے جنم موہے' بٹیا نہ کیجو' ملے جلے احساسات و محسوسات کے ساتھ ان میں ہر طبقے کی نمائندگی نظر آتی ہے اور واقعتاً" تقریر کی لذت یہی ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہمارے دل میں موجود تھا۔ اسکو کہتے ہیں فنکاری۔ اور پرکاری پس یہ ثابت ہوا کہ ادب میں ترقی کا راستہ کسی کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ قرۃ العین حیدر ہوں یا عبداللہ حسین' جیلانی بانو ہوں یا زاہدہ حنا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب نے جب 1976ء میں نقوش لطیف کو ترتیب دیا تھا۔ (یہ خواتین کے افسانوں کا انتخاب ہے) وہ اسکے ابتدایئے میں لکھتے ہیں "ان خواتین کی کہانیاں پڑھ کر اکثر اوقات میں اس سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ کہیں ہندوستان کی خواتین افسانہ نگار اردو ادب کے میدان میں مرد افسانہ نگاروں کو پیچھے تو نہیں چھوڑ جائیں گی۔ اس لئے کہ جہاں نئے مرد افسانہ نگاروں کے موضوعات محدود تھے وہاں خواتین نے ہماری سماجی زندگی کے ہر پہلو پر لکھنا شروع کر رکھا ہے۔ آج احمد ندیم قاسمی یقیناً بہت خوش ہوتے ہونگے کہ آج کی عورت کہانی کار نے انہیں مایوس نہیں کیا اور وہ آج بھی ہماری سماجی زندگی کے ہر پہلو پر بڑی دل جمعی سے جم کر لکھ رہی ہے۔ نہ وہ تھکی ہے اور نہ اسکا قلم تھکا ہے یقیناً ہر موضوع اسکا اپنا ہے چاہے قرۃ العین حیدر کا سیتا ہرن ہو یا عطیہ سید کا پری زاد۔ چاہے الطاف فاطمہ کا ہزار پایہ ہو یا نیلوفر اقبال کی گھنٹی۔

موضوعات تو انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں صلاحیت اور نقطہ نظر اپنا اپنا ہے۔

ادب کا میدان ہو یا عام زندگی ہماری خواتین افسانہ نگار لکھنے سے عاجز نہیں ہیں لوگ کہتے ہیں ادبی رسائل نہیں بکتے ڈائجسٹوں کا زمانہ ہے بھائی ڈائجسٹوں کا زمانہ ہے۔ انگریزی میں ڈائجسٹ نکلے تو ایک نام لے لینا کافی ہو گا Readers digest

جہاں قصے کہانی سے لے کر عام زندگی کے بحث طلب مسائل تک پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی نہ مسائل کی کمی ہے اور نہ ڈائجسٹوں کی چند ایک نام سن لیں سپنس ڈائجسٹ، سب رنگ ڈائجسٹ، عالمی ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ، مدیر بھی مرد لکھنے والے بھی مرد موضوع زندگی سے فرار، جن بھوت، ناگ دیوتا، جادو ٹونا، مافوق الفطرت کہانیاں، بے سروپا جاسوسی جرم سزا کی داستانیں۔ بتائیے یہ کیسا ادب ہے اور اس فرار سے کون سی تخلیق سامنے آتی ہے اسکا پڑھنے والا کس جہت کی طرف جائے گا۔ دوسرا رخ خواتین کے رسالے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ، شعاع، کرن، حنا، دوشیزہ وغیرہ وغیرہ یقیناً یہ صنف نازک کے رسالے ہیں ان میں رومان ہے درحقیقت انکے اپنے مسائل ہیں اور کہیں سکھ لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری یہ لکھنے والیاں بہت باشعور ہیں انہوں نے بھوت پریت، جادو ٹونا میں پناہ نہیں لی۔ حالانکہ عام طور پر زمین کی اس مخلوق کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ خواتین اوہام پرست ہوتی ہیں ہر لمحے مرد دانشور انکی اصلاح پر تیار نظر آتا ہے۔ زندگی کے مسائل کو اپنے انداز سے لکھتی ہیں۔ بلکہ اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندگی سے بھرپور معاشرے میں اپنے نسوانی ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے عورت ہو کر عورت کیلئے لکھنا کوئی بری بات نہیں بلکہ اسکی بڑی افادیت ہے اور کچھ نہیں تو پڑھنے کی عادت پڑتی ہے حرف شناس آتی ہے زندگی میں رنگ و نور نظر آتا ہے اور کٹھن لمحات آسانی سے گزر جاتے ہیں۔

اے آر خاتون، ناہید سلطانہ اختر، ایم سلطانہ فخر، رضیہ بٹ، زبیدہ، سلمیٰ کنول، ساجدہ حبیب، شکیلہ رفیق، مریم حسین، رضیہ جمیل اور بہت سی دوسری ادب کی اس دنیا میں معتبر نام ہیں۔ انہیں مرد بھی پڑھتے ہیں کہ کل کی برونٹی سسٹر یا آج کی جیکولین سوزلین۔ Daneal Steal کو کوئی مرد یہ سوچ کر پڑھنا توہین سمجھے گا کہ لکھنے والی عورتیں ہیں۔

بہر حال یہ موضوع بہت بڑا ہے اور اس پر ساری باتیں، اس مختصر مضمون میں نہیں کہی جا سکتیں اقبال نے کہا تھا وجود زن سے تصویر کائنات میں رنگ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ عورت کے وجود سے ہمارے افسانوی ادب کی ہر جہت منور ہے۔

لوگ کہتے ہیں اردو افسانہ روبہ زوال ہے بھلا افسانہ روبہ زوال کیسے ہو سکتا ہے۔ افسانہ تو اس دن تک باقی رہے گا جب تک قیامت نہیں آجاتی اور جب قیامت آئے گی تو وہ بھی ایک کہانی ہو گی اور کیا پتہ کہ اس کی تخلیق کار بھی کوئی بنت حوا ہی ہو۔

پنجابی ادب وچ عورت دا روپ

ثروت محی الدین

ایس دھرتی اتے وسن والی ساری لوکائی دا اوہ ادھا حصہ ' جیہڑا ساری لوکائی دے جمن پلن دی ذمہ داری نوں توڑ چڑھاون وچ آپنی حیاتی دا چوکھا حصہ ورت دیندا اے ' اوہدے کم تے محنت دی نہ تے کوئی خاص قدر ہوندی اے تے نہ ای اوہدے کم نوں کم ای آکھیا جاندا اے۔ سگوں دھرو تے بے انصافی اوسے دی جھولی پیندی اے۔ عورت نال ایہہ بے انصافی کدھرے کھلم کھلا تے کدھرے لکے ڈھکے انداز وچ ہمیش توں ای ہوندی آئی اے۔

مرداں دے بنائے ہوئے ایس معاشرے وچ اونہو قائیدے قانون لاگو ہوندے نیں جیہڑے مرد ای بناوندے نیں تو فیر اوہو فیصلے وی دیندے نیں۔ عورت نوں ہر ویلے ہر روپ تے ہر رشتے وچ مرداں دی مرضی مطابق اونہاں دے بنائے ہوئے اصولاں دے اندر رہ کے حیاتی دیاں اچیاں نیویاں راہواں اتے ٹرنا پیندا اے۔ ایہہ اصولاں تے لکیراں دا اک اجیہا جال ہوندا اے جس وچ عورت انج جکڑی جاندی اے کہ فیر آپنی مرضی دے مطابق حیاتی کٹنی تے اک پاسے ' اوہ کسے دوجی عورت لئی ______ بھانویں اوہ اوہدی آپنی جمی ہوئی دھی ای کیوں نہ ہووے ______ نہ کجھ کرن جوگی رہندی اے تے نہ ای کرنا چاہوندی اے ' کیوں جے پورے معاشرے نال لڑائی لڑنا اوہدے وسوں باہر ہوندا اے۔

عورت آپنی انفرادی حیثیت وچ کیس طراں دیاں مجبوریاں تے دباء تھلے دبی ہوئی رہندی ہے۔ اونہوں کوئی فیصلہ کرن توں پہلاں پیو' بھرا' خاوند یاں پتر دا فیصلہ سننا پیندا اے۔ ویسے وی کسی قسم دے فیصلے وچ عورت دا کوئی دخل ہوندا ای نہیں۔ پنڈاں دی پنچائت وچ کدے کسے نے سنیا اے جے کوئی عورت دی ہووے۔ اج توں سو دو سو سال پچھے جا کے ویکھو دنیا دے کسے وی حصے وچ کسے پدھراتے وی

کتے کسی عورت دا ناں نظر نہیں آوندا۔

موسیقی وچ جتھے Viraldi, Chaikorski, Mozzart, Bethoren امیر خسرو یاں تان سین نظر آوندے نیں اوتھے کوئی عورت کیوں نظر نہیں آوندی۔ مصوری وچ جے Rembrandt, Lenardo Davinci, Michelanglo' چغتائی تے استاد اللہ بخش نیں' اوتھے کیوں کسے عورت دا ناں نہیں ______

دنیا دے ادب دا ویروا جے اسیں Homer توں مُدھ بنھ کے کریئے تے کیس ناں لشکدے نظر آوندے نیں۔

Victor Hugo, Bandclaire, Tolstoy, Rumi, Hafiz, Bedit, Ghalib, Shakespear, Miltan, Keats, بڑی لمی قطار اے۔ پر عورتاں دے ناں اٹھارویں' انیہویں صدی توں پہلاں کدھرے نظر نہیں آوندے۔ جیہڑے ویلے عورتاں نے لکھنا شروع کیتا تے اونہاں نوں کوئی چھاپن نوں ای تیار نہیں سی ہوندا۔

Pride & Prejudice کے رہ Anonymous نوں Jane Austen تے Sense & Sensibility جیہیاں کتاباں کیوں چھپوانیاں پئیاں؟

Currer, Ellis تے Acton Bell نوں آپنے ناں Bronte Sisters کیوں رکھنے پئے؟ George Elliat نوں ناں کیوں بدلنا پیا؟ France وچ کے عورت نوں George Sand (جورج ساں) دے ناں تھلے کیوں لکھنا پیا؟

ایہہ ٹھیک اے جے عورتاں نوں پڑھاون لکھاون دا رواج ای نہیں سی۔ پر گل تے ایہہ اے پئی کیوں نہیں سی؟

ایہہ فیصلہ کون کردا سی پئی عورت دا کم صرف بچے پالنا تے گھر دی دیکھ بھال کرنا اے۔ ایس توں وکھ اوہ کجھ کرن دے قابل ای نہیں۔

عورت نوں آپنے نالوں نیواں درجہ دین وچ دنیا دے ہر معاشرے دا رویہ اکو جیہا رہیا اے۔ عورت دے نازک ہون نوں اوس دی کمزوری سمجھیا گیا اے۔ ایہہ وکھری گل اے پئی اندروں اوہ ہر لحاظ نال مرداں کولوں ودھ مضبوط تے ہمت والی ہوندی اے۔ اوہدا حوصلہ' صبر' محسوس کرن دی قوت تے برداشت دی

طاقت مرد دے مقابلے وچ کتے زیادہ ہوندی اے ______ پر مرد اونہوں کمزور تے لاچار آکھدے ہوئے نہ صرف اوہدے تے آپنی وڈیائی ٹھونسدے نیں، سگوں عورت دی عزت دے رکھوالے وی بن بیٹھدے نیں۔ افسوس تے ایس گل دا اے پئی مرد ای اوہدی عزت جس ویلے چاہون کھوہ وی سکدے نیں۔ جو کسی عورت اتے ظلم ہوندا اے یاں اوہدے نال زیادتی کیتی جاندی اے تے آکھیا کیہ جاندا اے، یاں خبر کیہ چھپدی اے، پئی فلاں عورت دی عزت لٹی گئی ______ گویا عزت عورت دا کوئی جیہا کپڑا لتا یاہ گہنا ہووے جنہوں جدوں کوئی مرد چاہوے کھوہ کے لے جاوے تے عورت اوس توں بغیر معاشرے وچ جیون دے قابل ای نہ رہوے۔ پر گل ایس ویلے میں ادب دے حوالے نال ای کراں گی۔ تے ادب دے اندر شاعری دے گھیرے وچ ای رکھاں گی۔

ہیر رانجھے دا قصہ اک بڑا پرانا قصہ اے، جس دا ہر کوئی جانو اے۔ ایہہ قصہ سبھ توں پہلاں سولھویں صدی وچ دمودر ناں دے اک بندے دا لکھیا ملدا اے۔ جیہڑا کہ پنجابی زبان وچ اے۔ پر ایس توں مگروں ایہہ ہور کئیں بندیاں نے لکھیا تے پنجابی توں وکھ ہندی اتے فارسی وچ وی لکھیا گیا۔

اٹھارہویں صدی وچ ہیر دا قصہ وارث شاہ نے اک اجیہے انداز نال پیش کیتا جے نہ اوس توں پہلاں تے نہ ای اوس دے مگروں کوئی ہور ایس قصے نوں انج بیان کر سکیا اے جیویں کہ وارث شاہ ہوراں کیتا۔

ہیر اک حد توں سوہنی، ماں پیو دی لاڈلی تے نازاں وچ پلی ہوئی اوہ کڑی اے جیہدا آپنے سارے علاقے وچ حکم چلدا اے۔ پر اوہو کڑی جس ویلے آپنے تالوں گھٹ Status سے اک منڈے نال عشق کر دی اے تے خیر اوہو لاڈ پیار کرن والے ماں پیو تے اوہو اوس دا ہر حکم منن والے سارے لوک اوہدے انج خلاف ہو جاندے نیں کہ اونہوں جانوں مار دین نوں وی جائز سمجھ لیندے نیں۔

ادبی لحاظ نال خوبیاں تے ایس وچ بے شمار نیں۔ جیہڑیاں بیان نہیں ہو سک دیاں پر وارث شاہ نے عورت نوں ایس سارے قصے وچ جس انداز نال پیش

کیتا اے' اوہ عورت دا اک اجیہا روپ اے جیہڑا آپنے حق لئی لڑن دا حوصلہ رکھدا اے۔ معاشرے وچ موجود اونہاں جھوٹیاں رسماں تے رواجاں دے خلاف آواز چکن دی ہمت رکھدا اے جیہدی وجہ توں کمزوراں اتے ظلم ہوندا اے۔ تے ایہہ ظلم ہیر آپنے اپر آسانی نال نہیں ہون دیندی۔ قاضی دے نال اوہدا ایہہ جھگڑا پئی شرح بندیاں اپر جبر کر کے اونہاں دی مرضی دے خلاف ویاہ کرن دی اجازت نہیں دیندی' تے آپنے ماں پیو تے بھرا نال اوہدا اوہ مکالمہ جیہدے وچ اوہ آپنا پورا زور لاوندی تے دلیلاں دیندی اے۔

ہیر آکھدی بابلا عملیاں توں نہیں عمل ہٹایا جا میاں
داغ امب تے سار دا لہے ناہیں داغ عشق دا وی نہ جا میاں
ایہہ رضا تقدیر ہو رہی وارد کون ہوونی دے ہٹا میاں
ہور سبھے گلاں منظور ہوئیاں رانجھے چاک تھیں رہیا نہ جا میاں

تے آپنے بھرا نوں آکھدی اے:

اکھیں لگیاں مڑن نہ ویر میرے بی بی گھول گھتی بلہاریاں وے
وہن پئے دریا نہ کدی مڑ دے وڈے لا رہے زور زاریاں وے
لہو نکلوں رہے نہ مول ویرا جتھے لگیاں تیز کٹاریاں وے
سر دتیاں باجھ نہ عشق پکے ایہہ بہن سکھالیاں یاریاں وے

ہیر دے روپ وچ سانوں اک اجیہی عورت نظر آوندی اے جیہڑی آپنے ارادے وچ پکی تے آپنے عشق وچ سچی آپنا حق لین لئی آپنی ساری ہمت تے پورا زور لا دیندی اے۔ بھانویں اوہ آپنے مقصد وچ کامیاب ہوندی اے یاں نہیں ہوندی' پر اوہ حالات اگے ہار نہیں مندی تے آخری دم تک لڑدی اے۔

ایہو روپ ہیر دا سانوں صوفی شعرا دے کلام وچ لبھدا اے۔ ہیر دا استعارہ اک اجیہی بھرپور علامت بن کے ساہمنے آوندا اے جیہڑا اوس سارے طبقے دی ترجمانی کردا اے جیہدے نال دھرو ہوندا اے۔

کلام بھانویں بلھے شاہ دا ہووے یاں شاہ حسین دا' سچل سرمست دا یاں

خواجہ فرید دا' شاعری نوں ساری لوکائی دی بھلائی لئی ورتن والے ہر اوس شاعر نے جنہیں ایس درد نوں محسوس کیتا تے جانیا اے اوس نے نہ صرف ہیر' سوہنی تے سسی دی گل کیتی اے سگوں ایس حد تک آپنے آپ نوں ایس دکھ نال جوڑیا اے جے آپ ہی اک عورت دا روپ وٹا کے شاعری کیتی ہے۔

"حاجی لوک مکے نوں جاندے
میرا رانجھا ماہی مکہ
نی میں کملی ہاں
میں منگ رانجھے یار دی ہوئیاں
میرا بابل کردا دھکا
نی میں کملی ہاں"

یاں فیر:

"کن فیکونوں اگے دیاں لگیاں
نیونہہ نہ لگیا چوری دا
اک رانجھا مینوں لوڑی دا"

ایہہ آکھ کے بلھے شاہ ہوریں ایس گل دا وی پک کردے نیں جے عورت آپنے عشق وچ کنی پکی تے (Committed) ہوندی اے' اوہ آپنے سچ وچ ذرا وی نہیں تھڑکدی۔

"جے مائے تینوں کھیڑے پیارے
ڈولی پادے کوئی ہور"

انج خواجہ فرید آکھدے نیں:

"جوگی رانجن میرا میتا　　دل نوں جس نے جادو کیتا
عشق تیندا لوں لوں سیتا　　رگ رگ مول نہ واندی ہے"
دل دم دم درداں ماندی ہے

تے شاہ حسین کہندے نیں:

"لکھی لوح قلم دی قادر   مائے موڑ جے سکنی ایں موڑ
ڈولی پالے چلے نیں کھیڑے   نہ میتھوں عذر نہ زور
رانجھن مینوں کنڈیاں پائیاں   دل وچ لگیاں دا شور
کہے حسین فقیر سائیں دا   کھیڑیاں دا کوڑا زور"

تے عورت دے ارادے دی مضبوطی کنج بیان کر دے نیں:

"میں وی جاناں جھوک رانجھن دی   نال میرے کوئی چلے
پیریں پوندی منتاں کر دی   جاناں تاں پیا کلے
نیں وی ڈونگھی تلہ پرانا   شینہاں پتن ملے
کہے حسین فقیر نماناں   سائیں سنہورے گھلے"

پر گل جیہڑی سوچن جوگی اے اوہ ایہہ اے پئی ہیر دا کردار جمیا کتھوں؟

جے اج اسیں ایہہ سوچدے ہاں پئی تعلیم زیادہ ہوون پاروں یاں آپس وچ Interaction ودھ جان دی وجہ نال اج دی عورت وچ ایہہ شعور پیدا ہو گیا اے، تے ایہہ گل ٹھیک نہیں۔

پنجابی شاعری دی کلاسیکی تاریخ نوں ساہمنے رکھئے تاں صاف نظر آوندا اے جے اوس زمانے وچ وی اجیہیاں عورتاں موجود سن جیہڑیاں ایس گل نوں سمجھدیاں سن پئی اوہناں نوں معاشرے وچ کیہہ تھاں دتی جاندی اے جیوندیاں جاگدیاں ہیراں اوس زمانے وچ ہوندیاں سن جنھاں نوں مکھ رکھ کے شاعراں ایہہ کردار گھڑیا اے۔

لوڑ صرف ایس گل دی اے جے اج دی عورت صدیاں پرانی ایس تحریک نوں اگانہہ لے کے ٹرے۔

سندھی عورت کی کہانی

عطیہ داؤد

سندھی عورت کی کہانی بھی اتنی ہی المناک ہے جتنی کسی بھی ترقی پذیر سماج کی عورت کی ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی فرق نظر آئے گا بھی تو اس سماج کے معاشی ڈھانچے، طبقاتی امتیاز، مقامی عقائد اور رسومات کی بنیاد پر ہو گا۔

سندھی عورت کے ماضی کی طرف نظر اٹھاتے ہی "موہن جوداڑو" کی صاف ستھری گلیوں میں آزاد اور کھلی فضاؤں میں خوشیوں کا رقص کرتی ہوئی، اعتماد کے ساتھ دنیا کو دیکھتی ہوئی عورت نظر آتی ہے۔ آج وہ عورت مورتی کی صورت میں یا تو عجائب گھروں میں یا انٹلیکچوئلز کے ڈرائنگ روم میں سجی ہوئی نظر آتی ہے۔

اپنے شاندار ماضی کی تاریخ میں دفن عورت کی جگہ میں آپ کو اس عورت سے ملوانا چاہتی ہوں جو آج کی عورت ہے۔ ہماری آج کی سندھی عورت کسی بھی میدان میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک تو کیا بلکہ اپنے ہی ملک، صوبے اور شہر کی اور زبان بولنے والی عورتوں سے پیچھے ہے۔ اس کو پیچھے کی طرف دھکیلنے میں ہماری سماجی نفسیات، طبقاتی امتیاز، رسم و رواج اور عقائد کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

کسی بھی سماج کا تجزیہ کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کا رہن سہن، کہاوتیں، لوک گیت، بچوں کے کھیل کا مشاہدہ کیا جائے۔ کیونکہ عام آدمی کی زبان ہی سماج کی سچی داستان سناتی ہے۔

سندھی کہاوتیں

"کھڈا گھر میں ہو تو کچرا باہر کیوں پھینکیں"

کوئی بھی بے جوڑ شادی کرتے ہوئے جواز کے طور پر یہ مثال دی جاتی ہے۔

"لڑکی گھڑا اٹھا سکنے کے قابل ہو جائے تو اس کی شادی کر دینی چاہئے"

کم عمری میں لڑکی کی شادی کرتے ہوئے یہ مثال دی جاتی ہے۔
''لڑکی شیر کے کاندھے پر بٹھا دینی چاہئے''۔
لڑکی اتنی کمزور ہے کہ اسے شیر جیسے بہادر اور مضبوط مرد کی حفاظت میں دیا جائے۔

ماں نونہال بچے کے ساتھ پیار سے جو باتیں کرتی ہے اسے ''کوڈنا'' لاڈ کی باتیں کہتے ہیں۔

تر ڑی تر ٹی نیشان' کونہ چھندس پیٹان
پلی چھندس پاؤ' جو رکا ینندو ماؤ

ٹھنڈے ٹھنڈے ہوں میرے نین' کبھی نہ پیدا ہو تیری بہن
شالا پیدا ہو تیرا بھائی' تیری ماں مسکرائے گی

''سو سکنس لینا پائنس' مور نھن سمیھون
پت آمرس کان اک نہ کیٹی ہو وجن واجمائیودیون
اچھی ذات والی سینکڑوں عورتیں میرے بیٹے کے لئے تڑپتی ہیں میرا بیٹا سستی سے آنکھ اٹھا ان کو دیکھتا تک نہیں۔

پاٹی ے ترندیون اچن' ابل گھون گھرندیون اچن ابل ونیون ست' مک ماڑی پی کر۔
میرے بیٹے کے لئے کئی عورتیں (سوہنی کی طرح) دریا میں کود پڑی ہیں۔ میرے بیٹے کی سات بیویاں ہوں گی۔ اک کوٹھی میں رہے گی دوجے اچھی چارپائی پہ بیٹھے گی۔

بچوں کے کھیلوں میں جنسی امتیاز

ذہنی اور جسمانی ورزش والے تمام کھیل لڑکوں کے لئے ہوتے ہیں

لڑکیاں گھر گھر اور گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ اپنے کھیلوں میں باپ اور بھائی کو دعائیں دیتی ہیں۔ اک کھیل میں قطار میں تمام بچیاں آنکھیں بند کر کے اک ہاتھ کھلا ہوا رکھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اک بچی ہاتھ میں چھوٹا سا پتھر لے کر کہے گی "چیچ مچیڑو کس کو دوں" تمام بچیاں جواب میں کہیں گی۔ "تیرا بھائی جیئے مجھے دو۔"

بھاگ دوڑ والے کھیلوں سے بچیوں کو منع کیا جاتا ہے۔ بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ لڑکی کے زنانہ عضو ڈھیلے پڑ جاتے لڑکی کو عام طور پر نو سال سے لے کر تیرہ سال تک کبھی بھی ماہواری آ سکتی ہے۔ ماہواری آتے ہی بچی کو عورت تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے ہر عمل پر سختی کی جاتی ہے۔ اس کے اندر کی معصوم اور کم سن بچی کو رسموں کی چھڑی مار مار کر دبایا جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے اور عقائد کی چلمک سے اس کے اندر سے زبردستی کھینچ تان کر اک عورت کو نکالا جاتا ہے۔ آج تک مائیں اور بڑی بوڑھیاں ماہواری کے دوران بچیوں کو بتاتی ہیں کہ اس دوران نہ تو دوڑا جا سکتا ہے نہ زیادہ چلا جا سکتا ہے۔ نہ سیڑھیاں چڑھی جا سکتی ہیں نہ اچار کھایا جا سکتا ہے اور عورت ناپاک ہوتی ہے۔ اس لئے دودھ تک نہیں پی سکتی اور لڑکی اگر کھیلے گی یا دوڑے گی تو اس کی چھاتیاں لٹک جاتی ہیں۔ اس لئے دیہات میں بچیاں پردے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ شہروں میں سکول کی بچیاں ذہن میں اس طرح کے عقائد کی وجہ سے ڈر اور خوف کی وجہ سے کھیلوں سے خود ہی دور رہتی ہیں اور ہاف ٹائم میں یا گیم کے پیریڈ میں بھی وہ آپس میں باتیں کرتی رہتی ہیں۔

لوک گیت

لڑکے کی پیدائش پر اس کی ہر رسم پر پہلی بار چلنے سے لے کر عقیقہ، سنت، شادی پر اس کے گیت ہیں جس میں لڑکے کو سہارا سمجھا جاتا ہے اور اس کو اعلیٰ درجے کا انسان سمجھا جاتا ہے۔ بیٹے کی پیدائش پر "اے بھاگوں والی عورت تم ساس سسر کی خدمت کرو کہ اللہ تم پر راضی ہوا ہے اور اس لئے تجھے بیٹا ہوا ہے۔"

"اک بیٹے میں سے مجھے اور بہت سے بیٹے پیدا ہوں گے ہمارے محلے ہونگے، نسل روشن ہو گی۔"

"بیٹے کی ماں کو جھولے میں جھلاؤ۔ سنگھار کراؤ۔ مٹھائی بانٹو" وغیرہ۔
مشہور لوک گیت "مور تو تلی راناٹا مور تو تلی" جب پہلی بار لڑکا خود سے چلنا شروع کرتا ہے تو خوشی میں اک رسم ادا کی جاتی ہے کہ "مور کی طرح چلتا ہے، کبھی ماموں کے کاندھے پر کبھی چاچے کے کاندھے پر بیٹھے گا۔ (میں نے بیسویں روپئے دے کر تیرے لئے نتھ جنوائی ہے) بیٹے تم سے بہت سے بیٹے پیدا ہوں گے۔ لاکھوں بیٹے ہر نگر پر وغیرہ۔

نصاب میں جنسی امتیاز

بچوں کے نصاب میں لڑکی کو خدمت گزار بڑوں کا کہنا ماننے والی ماہر اور شاکر بچی دکھائی جاتی ہے زندگی کے عملی کام فقط لڑکا ہی سرانجام دیتا نظر آتا ہے۔ سندھی کی دوسری جماعت میں اک نظم ہے۔

"میرے پیارے بھائی، تم پر سے بہن واری۔
بچپن میں تم بچے پیارے ہو، بڑے ہو کر میرے بھرپور سہارے ہو"

بچی جب بڑی ہونے لگتی ہے اور جوانی کے آثار نمودار ہونا شروع ہوتے ہیں تو ماں باپ پریشان ہونے لگتے ہیں، بچیوں کی جب چھاتی ڈیولپ ہونے لگتی ہے تو اکثر بڑی بوڑھیاں اک خاص قسم کے برتن سے مسلتی ہیں تاکہ وقتی طور پر اندر دب جائے کبھی تو دور سے ایسی ماہر عورت کو اس مقصد کے لئے بلوایا جاتا ہے۔ اس حالت میں جب فطرتی طور پر بچی کو خوف، تجسس اور پریشانی محسوس ہوتی ہے تو تصور کریں کہ اس عمل سے اسے کس قدر جسمانی اور ذہنی اذیت ہوتی ہو گی۔

کئی گھرانے عورت کی شادی ملکیت کے بٹوارے کے ڈر سے یا خاندانی انا کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی کرنا نہیں چاہتے۔ اسے عمر بھر کنواری بٹھا دیتے ہیں کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کے باپ بھائیوں کو سب کچھ دیا ہے۔ اس لئے اسے بی بی بنا کر "منصبی" پہ بٹھا دیا ہے یا قرآن شریف سے شادی کرا دیتے ہیں اس طرح عورت کو اخلاقی طور پر مجبور اور پابند کر دیا جاتا ہے کہ وہ کسی مرد کے متعلق کبھی سوچ بھی نہ سکے اور لوگ بھی پوچھنا چھوڑ دیں کہ اس کی شادی کب کرو گے؟ کچھ لوگ ایسی

لڑکیوں کو اک چھلا چڑھا دیتے ہیں تاکہ اس کی جنسی خواہش سرے سے ہی ختم ہو جائے۔

کچھ گھرانوں میں بہت سخت پردا کیا جاتا ہے۔ حویلی میں نومولود لڑکا تک نہیں جا سکتا۔ تمام عمر عورتیں کسی نامحرم کی شکل تک نہیں دیکھتیں۔ ضرورتاً" یا مجبوراً" نکلنا پڑے تو جیپ کے شیشوں پر ملتانی مٹی لیپ دی جاتی ہے۔ حویلی سے پارکنگ دور ہو تو راستے میں دونوں طرف مرید یا کسانوں کی بیویاں بڑی بڑی چادریں پکڑ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اس طرح وہ عورت جیپ تک پہنچتی ہے۔

کتنے ہی ایسے گھرانوں میں عورتوں کا جنازہ دن کے بجائے رات کو نکلتا ہے کہ بے پردگی نہ ہو۔ ان کی عورتوں کے الگ قبرستان بھی ہوتے ہیں۔ ایسا ہی اک مشہور تاریخی قبرستان سکھر کے قریب بکھر میں موجود ہے اسے "ستین جو آستان" پاک بیبیوں کا قبرستان کہا جاتا ہے۔

"کارو کاری" کی رسم تحت آشو قانون کے اس نقطے سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے کہ غیرت میں آ کر مرد نے قتل کر دیا ہے اس طرح اس کی سزا میں نرمی برتی جاتی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے مرد اپنی ذاتی دشمنی کی آگ بجھاتا ہے۔

ضلع لاڑکانہ کے قریب دوپہر کے وقت گھر میں اک عورت آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس کا شوہر گھر میں موجود تھا۔ اچانک باہر خون میں ڈوبی ہوئی کلہاڑی لے کر دیور اندر آیا' بتایا کہ کسی معمولی بات پر اس نے اپنے دوست کا قتل کر دیا ہے۔ ماں نے بہو کی طرف اشارہ کر کے کہا اسے مار دو۔ "کارو کاری" کہیں ہو جائے گا۔ شوہر نے اعتراض کیا تو ماں نے کہا۔ پاگل مت بنو۔ تمہیں اور بھی بیوی مل جائے گی۔ لیکن تجھے بھائی اور مجھے بیٹا تو دوبارہ نہیں ملے گا۔ اس معصوم عورت کے ہاتھ پر آٹا لگا ہوا تھا مگر کہا گیا کہ اسے موقعہ واردات پر پکڑ کر مارا گیا ہے۔

سندھ کے اک معزز گھرانے کی چھ سات لڑکیاں دشمنی کی بنیاد پر اغوا کرائی گئیں۔ ان کی تلاش میں خاندان کے مردوں نے دن رات اک کر دیا۔ آخر لڑکیاں حاصل کر لی گئیں۔ پھر ان کو گھر لایا گیا اور اک لائن میں کھڑا کر کے گولی مار

دی گئی کہ وہ "کالی" تھیں۔ وہ شخص پاکستان کے قانون کا وزیر بھی رہا ہے۔

سندھ کے اک بہت معزز اور مشہور گھرانے میں اب تک "اونٹنی" کی رسم ہوتی ہے۔ پیر صاحب کو یا خاندان کے کسی بھی مرد کو مرید یا کسان کی کوئی بھی لڑکی پسند آ جائے تو وہ اس کے باپ کو پیغام بھیجتا ہے۔ پھر اس لڑکی کو دلہن کی طرح سجا کر پیر جی کی حویلی میں بھیجا جاتا ہے۔ وہ جب تک چاہے اسے اپنے پاس رکھے گا۔ جب دل بھر جائے تو چند تحفے دے کر واپس کر دے گا۔ وہ لڑکی پھر عمر بھر شادی نہیں کر سکے گی اور نہ ہی کسی سے جسمانی تعلقات رکھ سکے گی۔ اسے پیر جی کی "اونٹنی" کہا جاتا ہے۔ اس کو بڑی عزت دی جاتی ہے۔ لوگ اس سے تعویذ بھی کرواتے ہیں "اونٹنی" کے جس پر پیر صاحب نے کچھ وقت کے لئے سفر کیا۔ اس عرصے میں اگر اس کو اولاد ہو جائے تو وراثت میں اس کو کچھ نہیں ملے گا۔

اس ہی خاندان کے پردادا نے اپنی ماں کی چھاتیاں خنجر سے کاٹ ڈالی تھیں کہ انہوں نے اک کسان کے بچے کو اپنا دودھ پلا دیا تھا۔

دیہاتوں میں کئی عورتوں پر جن بھی آتا ہے۔ یہ وہی عورتیں ہوتی ہیں جن کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھایا ہوا ہوتا ہے۔ جن نکالنے والا عورت کو بالوں سے پکڑ کر مارتا پیٹتا ہے۔ سندھ کے درگاہوں پہ کئی عورتیں لہراتی ہوئی نظر آئیں گی حال میں ہی بھٹ شاہ پر میں ایسی کئی عورتوں سے ملی۔ اک نوجوان عورت لہرا رہی تھی برابر میں اس کا بوڑھا شوہر دمے کا مریض کھانس رہا تھا۔ اک بیس سال کی خوبصورت لڑکی لہرا رہی تھی' اس کی ماں نے اپنی گود میں بیٹھے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو ادلے بدلے میں اس کی شادی کروں گی۔ میں نے کہا "جب تک تو یہ بوڑھی ہو جائے گی؟" اس نے کہا "ہم کس کو مفت میں تو نہیں دیں گے اور پھر میرے بیٹے کو اگر کسی نے رشتہ نہیں دیا تو ویسے بھی وہ لڑکیاں بھاگوں والی ہوتی ہیں جو بھائی کے لئے بدلے میں بیاہی جائیں ان کی سسرال میں بہت قدر ہوتی ہے۔ جن والی عورتوں کے رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ یہ ہمیں ان کا جن کہتا ہے کہ بھٹ شاہ پر لے چلو۔ اگر ہم نہیں لے آتے تو پھر گھر کا سامان توڑنے پھوڑنے

لگتا ہے۔ ہمیں بھی ڈراتا ہے۔ ان کو لہر لگاتے ہوئے دیکھ کر محسوس ہوا کہ لہر بھی اک رقص ہے جس طرح غم، خوشی اور انتظار کی کیفیات کے مختلف رقص ہوتے ہیں۔ یہ بھی فرسٹریشن کا اک رقص ہے کہ انسان کا من ہر حال میں اظہار چاہتا ہے۔

اس پس منظر سے آئی ہوئی کٹھن راستوں پر سفر کرتی ہوئی ہماری سندھی عورت بڑی مشکل سے یہ سفر طے کرپاتی ہے کہ مہتاب اکبر راشدی اور نورا لہدیٰ شاہ کے روپ میں اپنے ملک میں اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر پہچان کروا سکے ورنہ مجموعی طور پر ادب، صحافت، سیاست، تعلیم، سوشل ورکر، سائنس اور ٹیکنالوجی، آرٹ کے میدان میں ہماری عورت اپنے ملک کی عورتوں سے بہت پیچھے ہے۔ ہم ابھی تک اپنے چھوٹے سے کارنامے پر بھی روشن خیال مزدور سے بچوں کی داد وصول کرتے ہیں کہ سندھی عورت ہوتے ہوئے کمال کر دیا ہے۔

8 مئی 1992ء نورا لہدیٰ شاہ نے مارئی فورم کی جانب سے گولڈ میڈل دینے کی تقریب میں اپنے مقالے میں کہا:

"جس دور میں ہمارے ہاں شیخ ایاز جیسا مہان شاعر ہوتا ہے اور وہ اپنی تخلیق اور فن کی بلندیوں پر ہوتا ہے۔ اس دور کی ادیبائیں ابھی مشکل سے ہی لکھ سکنے کے دور میں داخل ہو پائیں تھیں۔ ثمیرہ زرین پر بھی سماج کی مروجہ قدروں کا اثر تھا۔ ماہتاب محبوب نے سماج کی گھریلو عورت کی بھرپور عکاسی کی ہے مگر ان کو اس ماحول سے آگے دیکھنا تھا۔ آگے چلنا تھا۔ آگے بتانا تھا۔ وہ انہوں نے نہیں کیا۔ اس دور میں سندھی ادیباؤں کو جس طرح ابھرنے دیا جانا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا۔ ثمیرہ زرین سے لے کر نورا لہدیٰ شاہ تک ان کو فقط قبول کیا گیا۔ سراہا گیا اور تالیاں بجائی گئیں۔"

ادیبائیں اپنے محدود مشاہدات وسائل، گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے کم مطالعے کی بنیاد پر ہر دور میں اپنے فن کا کچھ عرصے تک مظاہرہ کر کے کچھ اچھی تخلیقیں دے کر پھر ہمیشہ کے لئے منظر سے غائب ہو گئیں۔

سندھی ادبی سنگت جیسی ترقی پسند تنظیم میں اس کے وجود سے لے کر

آج تک آٹے میں نمک کے برابر دو یا تین ادیباؤں کا حصہ رہا ہے۔

سندھی ادیبوں کا رویہ اپنی تصویروں اور تقریروں میں تو عورتوں کے لئے بے شک حوصلہ افزا رہا ہے لیکن جب عورت سامنے آئے تو مر مٹنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے حسن کی تعریف کو جمالیاتی ذوق کہتے ہیں۔

اک تو خاندانی روایتی پابندیاں اور پھر ساتھی ادیبوں کے یہ رویئے۔ کئی ادیباؤں کو نام بدل کر لکھنا پڑا۔ ثریا سوز ڈیپلائی مشہور سندھی ادیب اور صحافی محمد عثمان ڈیپلائی کی بیٹی ہیں۔ اس کا اصل نام نسیم تھا لکھنا شروع کیا تو اس طرح کی مشکلات درپیش آئیں اس لئے خود ڈیپلائی صاحب نے انہیں نام بدل کر لکھنے کی تجویز دی۔ اس کے علاوہ ج۔ ع۔ منگھانی' "میراں" "مس زیڈ اے شیخ" سلطانہ وقاصی وغیرہ ہمیں مس زیڈ اے شیخ۔ مشہور صحافی شیخ عزیز کی بہن ہیں۔ سلطانہ وقاصی جو پہلے اکرم سلطانہ کے نام سے لکھتی تھیں۔ نام اس لئے بدلا کہ 1973-74 کے زمانے میں اک مشہور شاعر نے اک شاعرہ کے ساتھ دوسری شادی کر لی تھی۔ اس شادی کی ادبی دنیا میں بہت مخالفت ہوئی تھی۔ سلطانہ وقاصی اس بات پر شرمندہ تھیں کہ لوگ سندھی ادیباؤں کے لئے غلط سوچنے لگے ہیں کہ یہ ادبی دنیا میں فقط شوہر ڈھونڈنے آتی ہیں۔ اس شرمندگی پر انہوں نے اپنا نام تک بدل دیا۔

مشہور سندھی ادیب "نسیم کرل" جس کا نام کیونکہ لڑکیوں جیسا تھا' جب اس نے لکھنا شروع کیا تھا تو اسے لڑکی سمجھ کر کئی مشہور ادیب اور دانشوروں کے محبت نامے موصول ہوئے۔

ہمارے مشہور ادیب اور دانشوروں نے دو شادیاں کی ہیں شیخ ایاز' تنویر عباسی' امداد حسینی' نثار حسینی' عبدالقادر جونیجو' عنایت بلوچ' ہدایت بلوچ' بیدل مسرور' رسول بخش پلیجو وغیرہ چند مثالیں ہیں۔

سیاست میں سندھی عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لئے بھی کہ سیاست میں حصہ لینے کے لئے کسی ڈگری یا شیلڈ کی شرط نہیں ہوتی۔ مگر سندھی عورت کو سیاست میں کٹھ پتلی کی طرح لایا گیا ہے۔ جتنی بھی ہمارے ہاں سیاسی تنظیمیں ہیں ان

کے پاس عورتوں اور بچوں کی ذیلی تنظیمیں ہوتی ہیں۔

سندھی کی ابھرتی ہوئی اچھی شاعرہ سحر رضوی نے 16 ستمبر 1991ء میں پکار اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

"میں اچھا بول سکتی تھی' اعتماد کے ساتھ بحث کر سکتی تھی۔ ادیبہ کی حیثیت سے جیسے ہی ابھرنے لگی تو سیاسی تنظیموں نے مجھے باز کی طرح جھپٹ لیا۔ پہلے تو میرا بھی نیا نیا شوق تھا لیکن آگے چل کر محسوس ہوا کہ میرے ذہن میں تو ٹیپ شدہ کیسٹ رکھ دی گئی ہے۔ فقط بٹن دبانے کی ضرورت ہے۔ میں وہی بولنے لگتی ہوں جو وہ چاہتے ہیں۔"

عورتوں کی تنظیم میں رہتے ہوئے عورتوں کے مسائل پر کام نہ کر سکنے کی وجہ بتاتے ہوئے سحر رضوی نے کہا:

"سندھی خاندانوں کی انا پرستی والی بات بہت مشکل ہوتی ہے۔ لاڑکانہ ضلع میں عورتوں کو لیکچر دیتے ہوئے میں نے دیکھا۔ اک عورت رو پڑی' میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ شوہر نے بغیر اجازت دوسری شادی کر لی ہے۔ اس عورت کی ہم قانونی مدد کر سکتے تھے لیکن تنظیم کے دوستوں نے کہا کہ وہ عورت تو فلاں ساتھی کی بہن ہے اس کو سخت اعتراض ہو گا کہ اس کے گھر کی باتیں تنظیم میں زیر بحث کی جائیں۔"

اسی طرح کے اک سوال کا جواب دیتے ہوئے جئے سندھ تنظیم کی عورتوں کی ونگ "سندھی ناری تحریک" کی جنرل سیکرٹری گلشن لغاری نے کہا:

"اس طرح کے واقعات کوئی ایک دو تو نہیں ہوتے' ہر روز سینکڑوں عورتوں پر ظلم ہوتا ہے۔ ہم تو یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اتنی بڑی ناانصافیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ کئی ایسے مسائل تھے جو خود ہماری تنظیم کی عورتوں کو یا تنظیم کے ساتھیوں کی گھر کی عورتوں کو پیش آئے۔ مگر ہم کچھ نہیں کر سکتے کہ یہ خاندانی عزت اور انا کا مسئلہ ہوتا ہے۔"

سیاسی تنظیموں کی عورتیں دیہات میں عورتوں سے کیا باتیں کرنے جاتی

ہیں اس کے متعلق ناری تحریک کی گلشن لغاری نے کہا:

"ہم اپنی پارٹی کے پروگرام کے متعلق بتاتے ہوئے ان کو یہ سمجھانے کی کوششیں کرتے ہیں کہ کس طرح قومی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے سماجی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔"

سندھیانی تحریک کی غلام فاطمہ اور مریم پلیجو نے کہا:

"سندھیانی تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے عوامی تحریک کے ساتھی جب تنظیمی دوروں پر جاتے تھے یا جیل گئے تو گھر کی عورتیں انہیں بہت پریشان کرتی تھیں۔ پھر ہمیں خیال آیا کہ کیوں نہ ان عورتوں کو بھی شعور دے کر گھر سے باہر نکالا جائے۔"

سندھ انقلاب دوست کی عورتوں کی ونگ کی مرکزی صدر سحر رضوی نے کہا:

"ہمیں یہ ہی کہا گیا تھا کہ عورتوں میں اپنی پارٹی کو متعارف کرواؤ۔ مگر میں جب ان عورتوں سے ملی تو خود دکھی ہو گئی کہ ان عورتوں کو اپنے متعلق نہیں معلوم یہ پارٹی کے متعلق جان کر کیا کریں گی۔ میں مزید شرمندہ اس وقت ہوئی جب "منجل میر بھر" گاؤں کی عورتوں سے میں نے کہا کہ "ہم آپ کو حالات سے آگہی اور شعور دینا چاہتے ہیں" تو اک عورت نے کہا "یہاں سے وادھو نہر بہتی ہے، اس میں کتے اور بلیاں مری ہوئی ملتی ہیں۔ ہم اس کا پانی پیتے ہیں۔ بول بہن تم ہمیں کیا شعور دو گی۔"

سیاسی تنظیمیں کس طرح اپنی عورتوں کو ونگز کے ساتھ سلوک کرتی ہیں۔ سحر رضوی نے بتایا:

"سندھ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے میر تھیبو والوں نے 88-1978ء میں عورتوں کی الگ تنظیم "ماروی" بنانے کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ اس وقت رسول بخش پلیجو کی سندھیانی تحریک زور شور سے ابھر رہی تھی۔ سیاسی جلسے اور جلوس میں وہ ٹرک بھر کر عورتیں لاتے تھے۔ ان سے مقابلے کی خواہش میں کمیونسٹ

پارٹی کو بھی خیال آیا اور جلدی اس پر عمل بھی کرنا چاہ رہے تھے ہم نے ماروی تنظیم کے لئے ایک سو عورتیں اکٹھی کیں اور سکھر میں جمع ہوئے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ الیکشن کروائے جائیں۔ ساتھیوں نے کہا "عورتوں میں اتنا شعور نہیں ہے"۔ میں نے کہا "ان کا حق تو ہے! موقع ملے گا تو شعور بھی آ جائے گا"۔ ہم ابھی بات کر ہی رہے تھے کہ باہر سے لسٹ بن کر آ گئی کہ فلاں فلاں عورت کا یہ عہدہ ہے۔ پریس سیکرٹری شہناز بزدی کو مقرر کیا تھا۔ مگر پریس ریلیز بھی خود ہی بنا کر فقط شہناز سے دستخط لینے کے لئے لے آئے۔ میں نے احتجاج کیا تو میر تھیبو نے کہا کہ "سحر بہت بولتی ہے"۔

سیاسی تنظیموں کی طرح سندھ میں عورتوں کی کئی سماجی تنظیمیں بھی ہیں۔ ان میں پڑھی لکھی باشعور عورتیں موجود ہوتی ہیں۔ مگر وہ بھی اس طرح کہ کچھ عورتوں کو کچھ نہ کچھ سرگرمیاں کرنے کا خیال آتا ہے۔ وہیں عہدہ بانٹ کی تنظیم بنا لیتی ہیں وہ ابھی یہ طے بھی نہیں کر پاتیں کہ ان کے کیا مقاصد ہیں کیا ترجیحات ہیں کس طرح، کن لوگوں میں اور کیا کام کرنے ہیں۔ اس سے پہلے خاص طور پر عہدوں کی وجہ سے اختلافات ہو کر وہ تنظیم ٹوٹ کر مزید برانچوں میں تقسیم ہو کر اک الگ تنظیم ہو جاتی ہے۔

مشہور سندھی رائٹر ڈاکٹر فہمیدہ حسین جو سندھ گریجویٹ ایسوسی ایشن کی عورتوں کی ونگ کی صدر ہیں۔ وہ 30 جنوری 1994ء میں جاگو اخبار کے کالم میں لکھتی ہیں کہ "سندھی گریجویٹ ایسوسی ایشن کی مرکز دور اس کی ہر برانچ جتنی ہی مکمل اور منظم ہے۔ جس طرح وہ فلاحی کاموں میں صفائی کردار ادا کر رہی ہے۔ تعلیم، صحت، روزگار میں باقاعدہ کام کر رہی ہے اس کے برعکس ہماری عورتوں کی برانچ اتنی ہی غیر منظم اور غیر فعال ہے۔ گزشتہ دو تین سالوں سے ہم نے بہت کوششیں کیں۔ لیکن چند میٹنگز اور اک دو معمولی فلاحی کام کے علاوہ ہم باقاعدگی سے منظم اور مستقل منصوبے کی نوعیت کا کوئی کام نہیں کر سکے۔ ہمارا ایک چھوٹے سے گروہ کے علاوہ باقی تمام خواتین الیکشن کے بعد کچھ دن گرم جوشی دکھا کر پھر چپ کر کے گھر جا بیٹھتی ہیں

اور ہم _____ کارکنوں کے لئے کچھ نہیں کرپاتے۔"

نومبر 1991ء میں آل سندھ وومن ایسوسی ایشن نے تھر میں قحط آنے کی وجہ سے تھریوں کی امداد کے لئے ایک کلچر پروگرام اور نمائش کا بندوبست کیا۔ تھر کے مسائل کا سروے کئے بغیر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہاں کنویں کھدوائیں گے۔ ان کو اس نمائش سے دو لاکھ روپے وصول ہوئے۔ نمائش منعقد ہونے کے کئی دنوں کے بعد انہیں یہ معلوم ہوا کہ تھر کی سر زمین کے مطابق وہاں کنویں کھدوانا آسان بات نہیں۔ جو پہلے وہاں کنویں موجود ہیں وہ بھی سوکھے پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی ایک کنویں پر ایک لاکھ خرچہ آئے گا۔ پھر بعد میں وہ تھر کے فقط چھاچھرو ضلع میں کچھ کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں بانٹ کر واپس آ گئیں۔

ہمارے ہاں عورتوں کی سیاسی اور سماجی تنظیموں کی کمی نہیں ہے۔ یہ بات یقیناً باعث فخر ہے کہ دیہات اور چھوٹے شہروں سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں اب ہزاروں کے مجمع کے سامنے جوشیلی تقریریں کر سکتی ہیں فلک شگاف نعرے لگا سکتی ہیں سفر کی سختیاں سہ کر تنظیمی دورے کرتی ہیں کئی عورتیں جیل بھی کاٹ کر آئی ہیں مگر ان کی اس ہمت اور جذبے کا فائدہ سندھ کی عام عورت کے بجائے پارٹی کے ذاتی مفاد کو پہنچتا ہے۔

سیاسی تنظیموں میں موجود بڑی تعداد ان عورتوں کی ہے جن کے باپ' بھائی' بیٹا یا شوہر پہلے ہی اس تنظیم میں موجود ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ سندھی مرد نے خود کو اتنا روشن خیال ثابت کیا ہے کہ گھر کی عورت جس کو ذاتی ملکیت جانتا ہے اسے کئی مردوں کے سامنے سڑک پر لا کر ٹھپلے لگواتا ہے۔ مگر کیونکہ اس میں عورتوں کا اپنا شعوری عمل دخل نہیں ہوتا اس لئے وقت گزرنے کے ساتھ باوجود جوش جذبے اور سچائی کے ان میں ذہنی پختگی نہیں آتی۔

فوزیہ بھٹو قتل کیس میں فقط اک دو سندھی عورتوں نے انفرادی طور پر اخبارات میں بیان دیا تھا۔ عورتوں نے اس سلسلے میں مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں سحر رضوی نے کہا: "تنظیم نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے انفرادی طور

پر حیدر آباد سے لاڑکانہ تک دورہ کیا۔ عورتوں سے اور تنظیموں سے ملی سندھیانی تحریک، جیئے سندھ ونگ، ناری تحریک کی عورتوں کو ساتھ دینے کے لئے کہا لیکن انہوں نے واضح طور پر انکار کرتے ہوئے کہا کہ "ہم فوزیہ بھٹو کے کردار کو صحیح نہیں سمجھتے"

سندھیانی تحریک کی غلام فاطمہ اور مریم پلیجو نے کہا: "ہم نے مخالفت نہیں کی، لیکن اپنی ذاتی مجبوریوں اور مصروفیات کی وجہ سے خاص طور پر کراچی میں کوئی سرگرمی نہیں کر سکتے۔

حال میں ہی مورو شہر میں ایک اٹھائیس سالہ حسینہ سوہو جو تین بچوں کی ماں تھی۔ یتیم تھی۔ اس کے نام کی ملکیت پر چچا قابض تھے۔ شوہر ملکیت لینے پر اسے مجبور کرتا رہا۔ وہ چچا کے پاس گئی۔ گڑگڑائی۔ چچا نے جھوٹی تسلی دے کر سادہ کاغذ پر دستخط لئے پھر اسے بتایا کہ اب تو تم خود ہی ملکیت کے حق سے دستبردار ہو چکی ہو۔ روتی ہوئی شوہر کے پاس گئی۔ شوہر نے دھکے دے کر تین کپڑوں میں تین بچوں کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ دوبارہ چچا کے پاس آئی کہ شاید اسے رحم آ جائے۔ حسینہ کو قتل کر دیا گیا۔ لاش پر تشدد کے نشانات تھے۔ مگر اس کیس کی ایف آئی آر تک نہیں کٹی۔ حسینہ کی سب سے چھوٹی بچی آٹھ ماہ کی تھی۔

ایسی کئی عورتیں ہر روز قتل کی جا رہی ہیں۔ انا کا شکار ہو رہی ہیں۔ حال میں ہی ہیومن رائٹس کے ایک پروگرام میں انیس ہارون نے مقالہ پڑھتے ہوئے بتایا تھا کہ سندھیانی تحریک میں عورتوں کی تعداد پچاس ہزار ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ ہماری تمام سیاسی اور سماجی تنظیموں کی پچاس عورتیں بھی ایک ساتھ عمل کے میدان میں آ جائیں تو حسینہ سوہو جیسی کئی عورتوں کی وارث بن سکتی ہیں۔ کئی عورتوں کو قانونی مدد دلوا سکتی ہیں۔ نابالغ لڑکیوں اور لڑکوں کی شادیاں قانونی مدد سے رکوا سکتی ہیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی کر پائیں تو کم سے کم ایسے کٹھور ظالم لوگوں کی نام نہاد عزت اور ساکھ کو لوگوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں۔ وہ لوگ جو شریف بن کر عزت کی بڑی سی پگڑی باندھ کر سینہ تان کر چلتے ہیں ان کے خلاف آواز

اٹھا کر ان کو اتنا تو احساس دلوا سکتی ہیں کہ آئندہ وہ عورت اور مرغی کی گردن پر چھری رکھتے ہوئے فرق محسوس کر سکیں۔

ہماری شہروں کی وہ باشعور عورتیں جو خوش قسمتی سے عمل کے میدان میں ہم سے آگے ہیں۔ ان کے اور ہمارے احساسات اور جذبات میں کوئی فرق تو نہیں۔ فرق ہے تو فقط زبان کا۔ لیکن کیا یہ اتنا بڑا فرق ہے کہ انہوں نے خود کو شہری عورتوں کے مسائل تک محدود کر لیا ہے۔ کیا وہ اتنی بھی سندھی زبان اب تک نہیں سمجھ پائیں کہ سندھی اخبارات کے ذریعے سندھی عورت پر ہونے والے ظلموں سے آگاہ ہو سکیں۔

کہیں بھی، کسی بھی مذہب اور زبان سے تعلق رکھنے والی کوئی بھی عورت جب بھی دوسرے درجے کے انسان ہونے کے ناطے ریتوں، رسموں، عقائد مذہب قانون اور جھوٹی انا کی صلیب پہ لٹکائی جاتی ہے تو ہم سب جو اس سے زیادہ شعور رکھتے ہیں اس کے مجرم ہیں۔

خواتین اور ادیب خواتین کے مسائل

مسرت لغاری

جہاں تک خواتین کے مسائل و مصائب کا تعلق ہے تو وہ ہم سب جانتی ہیں اور ہماری بدقسمتی ہے کہ عورت جہالت کے کالے دور سے لے کر سائنس کی موجودہ چکاچوند تک ہر لمحہ، ہر قدم پر اور ہر سطح پر مردانہ استحصالی معاشرے کا شکار ہے اور سب سے بڑا صدقہ بلکہ حیرت اس بات پر ہے کہ مردوں کی جانب سے آنے والے وار اور تیر میں چنی جانے والی یہ انار کلی، اصلی انار کلی کی طرح خوش قسمت بھی نہیں ہے کہ ایک ہی بار سنگسار کر دی جائے بلکہ اسے زندگی کے نام پر ہولے ہولے قسطوں میں سنگسار کیا جا رہا ہے جبکہ بظاہر اسکی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ سلیم شیخو کی ہی نگاہ شوق ہے لیکن اس پر پھینکے جانے والا ہر پتھر بھی سلیم شیخو ہی کے ہاتھوں آرہا ہے۔ کوئی سلیم اپنی انار کلی کو بچانے کے لئے آگے نہیں بڑھتا ہے اسلئے کہ سب کی راہ میں اپنی اپنی موٹی "میں" کے بھاری پتھر موجود ہیں۔

دیکھا جائے تو یہ کائنات جو کہ خداوند تعالٰی کی ایک خوبصورت تخلیق ہے اسے خوبصورت تر بنانے کے عمل میں ہر سطح پر عورت شامل اور شریک ہے وہ تخلیق آدم سے لے کر اس کی پرورش و پرداخت اور دوسری سینکڑوں قسم کی ذمہ داریاں بہ احسن و خوبی ادا کرنے کے باوجود مرد کے جبر و ظلم کا مسلسل نشانہ بنی ہوئی ہے وہ جو کبھی رابعہ بصری تھی، فاطمہ بنت رسول اور زینب بنت فاطمہ تھی رضیہ سلطانہ اور جھانسی کی رانی تھی، جو اب بھی بینظیر بھٹو ہے، خالدہ ضیاء ہے کوری اکینو ہے چلو ہے مگر کس قدر لرزہ خیز ہے یہ حقیقت کہ وہ سندھ کی نوری بھی ہے کراچی کی وینا حیات بھی ہے، ڈھوک کھبہ کے درندہ صفت باپ کی بیوی بن جانے والی نو خیز کلی بھی ہے، بھاٹی گیٹ کے چچا کی دلہن بھی ہے، نواب پور کے بھرے بازار میں ننگا ناچ کرنے پر مجبور ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی قطار میں بھی شامل ہے اور انتہا یہ کہ

پنڈی کی زینب نور بھی ہے جسکا اندرونی نازک نظام بجلی کے جھٹکے دے دے کر اسکے
شوہر نے جلا کر راکھ کر ڈالا ہے۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ایسے **گھبیے** مجرموں
کو مردانہ معاشرہ کوئی سزا دینے کی بجائے مرد ہونے کی چھوٹ دے کر اسے بالواسطہ
طور پر ایسے مزید جبرو بربریت پر تیار کرتا رہتا ہے ورنہ اگر کسی ایک بھی ظالم و جابر کو
عبرتناک سزا دی جاتی تو ایسے قیامت خیز واقعات بار بار نہ دہرائے جاتے۔ وجہ اس کی
یہ ہے کہ مرد خود کو خود سنگسار کیسے کر سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی نجی زندگیوں میں
بھی ایسے ہی لرزہ خیز مظالم اور درندگی کی گنجائش رکھنی ہوتی ہیں اور یہ کھیل اس قدر
پر اسرار اور **گھبیے** ہوتے ہیں کہ نہ ان کی تصویر اتر سکتی ہے نہ ہی اخبار میں اسکی خبر
آسکتی ہے۔

میری نظر میں عورت کے پاس ہر سطح پر مرد کے ظلم و تشدد سے بچنے کا
صرف ایک ہی چارہ کار رہ گیا ہے کہ اسے تعلیم کی روشنی سے منور کیا جائے وہ اپنی
زندگی کا سفر اپنے اندر کی روشنی میں طے کر سکے اس طرح اسے اپنے حقوق کا ادراک
حاصل ہوگا اور جب ادراک حاصل ہو جائے گا تو پھر وہ آگے بڑھ کر خود اپنے حقوق
چھین لے گی۔

آج ہم مٹھی بھر پڑھی لکھی خواتین یہاں جمع ہیں جو اپنی ان پڑھ بہنوں
پر ہونے والے مظالم اور تشدد پر کڑھ رہی ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم میں خود آگہی
موجود ہے ہماری یہ خود آگہی اپنی مظلوم بہنوں میں صرف اس صورت میں منتقل ہو
سکتی ہے کہ انکی تعلیم کیلئے ٹھوس بنیادوں پر اقدامات پر زور دیا جائے کیونکہ میں سمجھتی
ہوں محض اچھے الفاظ کی جادوگری میں مسائل کو لپیٹ کر پیش کر دینا بجائے خود
مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ اس کے حل کیلئے ہمیں عملی طور پر میدان میں آنا ہوگا
بہرحال یوں تو خواتین قدم قدم پر مسائل میں گھری ہوئی ہیں لیکن میں ادیب بہنوں
کے مسائل کا مختصرا" ذکر ضرور کروں گی یعنی جن مظالم و مسائل کا میں نے پہلے ذکر کیا
ہے اگر رائٹر بہنیں یہ سب کچھ لکھ کر اپنا فرض پورا کرنا چاہیں تو بھی وہ بہ احسن و
خوبی نہیں کر سکتیں کیونکہ انکے لئے تخلیق جیسے عمل سے گزرنا انتہائی بے فیض

کارروائی بنکر رہ جاتا ہے اول تو خواتین کیلئے گھر کے سینکڑوں کاموں اور مسائل ذمہ داریوں، رشتہ داریوں اور بچوں کی پرورش و پسرداخت سے ہاتھ نکال کر لکھنا ہی بہت مشکل ہے لیکن اس سے بڑی مشکل یہ ہے کہ انکو اپنی تخلیقات کی اشاعت میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگر پبلشر برائے نام ادائیگی کر کے کتاب چھاپ دے تو خود اس سے لاکھوں کا فائدہ اٹھاتا ہے اور اگر رائٹر خواتین اپنے سرمائے سے یہ سب کچھ کر گزریں تو بک سیلر سالوں کیلئے آدھی قیمت پر کتاب سٹالز پر رکھ کر بوند بوند ادائیگی کرتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تخلیق لکھنے والے کیلئے بجائے خود ایک Reward اور Award ہوتی ہے لیکن وہ کسی مالی صلے کی توقع نہ بھی رکھے تو بھی اسے اپنی مزید تخلیقات کو شائع کرانے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ تخلیق کا چشمہ کبھی خشک نہیں ہوتا لکھنے والے کے لئے لحہ لحہ سوچ بچار اور تفکر و تدبر کے نئے نئے افق نکلتے ہیں تو کیا وہ ان کو ڈھانک کر رکھ سکتا ہے؟

اس حوالے سے دو تجاویز میرے ذہن میں ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو اس مسئلے کا حل کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

(1) حکومت ایسے اشاعتی ادارے قائم کرے جس میں خاص طور پر خواتین رائٹرز کے معیاری مسودے معقول معاوضے پر خرید کر انہیں شائع کیا جائے اور کتابوں کی نکاسی سکولز، کالجز، اور یونیورسٹی لائبریریوں میں کر دی جائے تاکہ حکومت مالی خسارہ برداشت نہ کرے۔

(2) دوسری تجویز یہ ہے کہ رائیٹر خواتین اپنی کتابیں خود اپنے سرمائے سے شائع کریں لیکن حکومت حتمی طور پر ملک بھر کے سکولز کالجز یونیورسٹیز، لائبریریوں کو ایک آرڈر کے ذریعے پابند کرے کہ وہ **مصنفات** کی کتابیں خریدیں اس سلسلے میں رائیٹر خواتین کو بھی حکومت کتابوں کی منظوری کا آرڈر بھجوائے تاکہ لائبریریاں وہ کتابیں خریدیں اور خواتین کو شال شال پھرنے کی ضرورت نہ رہے۔

عورت بطور فرد کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی شاعری میں

ارشاد خالد

" نوجوان عورت --- میری رائے میں تم شرمناک حد تک جاہل ہو تم نے آج تک کوئی قابل ذکر دریافت نہیں کی۔ تم نے کبھی کسی سلطنت کی بنیادیں نہیں ہلائیں اور نہ ہی میدان جنگ میں کسی فوج کی قیادت کی۔ شیکسپیر کے کھیل (ڈراموں) تم نے تحریر نہیں کئے، اور نہ ہی تم نے کسی وحشی اور جنگلی قوم کو تہذیب کی برکات سے آگاہ کیا بتاؤ ان سب ناکامیوں کیلئے تمہارا جواب کیا ہے؟" (ورجینا دولف)

شاعری انسان کی " روح" میں کائنات کے الوہی نغمے کی گونج ہے یا اسکے جسم میں اس پر ایک طویل بحث ممکن ہے۔ اور پھر بھی شاید اسکا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ لیکن اس بات سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ مردوں کی بنائی ہوئی اس دنیا میں نامور مرد شاعروں کی تعداد زیادہ ہے ان مرد شاعروں کی شاعری میں عورت یا تو ایک نفس مضمون کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے یا پھر انکے تصور کی ڈوری سے بندھی ہوئی ایک کٹھ پتلی۔ وہ ایک جیتے جاگتے، زندہ، متحرک اور فعال وجود کے طور پر دکھائی نہیں دیتی۔ بڑے شاعروں میں انگریزی زبان کے شاعر بلیک Blake کو استاد کا درجہ حاصل ہے بلیک کی Songs of Innocence & Experience میں بچوں اور عورتوں کے احساس کو پوری طرح محسوس کر کے لفظ بند کیا گیا ہے۔ بعض نفسیاتی ناقدین کی رائے میں اسکا سبب ژنگ کی اصطلاح میں بلیک کا اپنے نسوانی ہمزاد Anima کو کھلے دل سے قبول کرنا ہے۔ جس نے اس میں یہ قدیم المثال صلاحیت پیدا کر دی تھی شاعروں نے بڑی خوشدلی سے عورت کو شاعری کا موضوع تو بنایا ہے۔ لیکن خود عورت کا شاعری کرنا بھی معیوب اور کبھی مشکوک اور اکثر اوقات معیوب و مشکوک سمجھا گیا ہے۔

ہماری پدر سری معاشرت و ثقافت میں عورت فرد کی بجائے شے کی طرح سمجھی جاتی ہے۔ وارث شاہ کی ہیر کی یہ سطریں دیکھیں۔

"وارث رن فقیر تلوار گھوڑا
چاروں تھوک کے دے یار ناہیں"

اور پیلو کی مرزا صاحباں میں ٹیمل اپنے بیٹے مرزے خاں کو مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"بیٹھ رناں دی دوستی کھڑی چھاں دی مت
ہس ہس لاوندیاں یاریاں تے رو رو دیندیاں دس
جس گھر لائیے دوستی مول نہ گھتے لت"

معروف ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے جب الیکٹرا کمپلیکس کے حوالے سے عورت کو اخلاقی اقدار سے عاری قرار دیا۔ تو حقیقت میں وہ یہ دیکھنے میں ناکام رہا تھا کہ عورتوں کی اکثریت مردوں کی مخصوص اخلاقی اقدار کو بے معنی سمجھتی ہے۔ تجزیہ نگاروں کا یہ عمومی خیال کہ چونکہ عورت مردوں کے بنائے ہوئے سماج میں رہتی ہے۔ اس لئے وہ ان اقدار کو اپنا لیتی ہے مکمل طور پر درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت مردوں کے تشکیل کردہ اقداری نظام کو اگر ظاہری طور پر نہیں تو باطنی طور پر مسترد کرتی ہے اور اسی لئے مردوں کی اکثریت شعوری برتری کے اظہار کے باوجود عورت سے لاشعوری طور پر خوفزدہ رہتی ہے۔

عورتوں کی آزادی کی تحریک تاریخی طور پر تو اتنی ہی قدیم ہو گی۔ جتنا خود یہ پدر سری نظام۔ عورتوں کی ایسی شاعری جس میں عورت کی صورتحال بھی ہے اور اسکا اظہار ایک فرد کے طور پر بھی ہے۔ میں میراں بائی' قرۃالعین' طاہرہ سلویا پلا تھی اور اینی سیکسٹن کے نام قابل ذکر ہیں۔ پاکستان کی اردو شاعری میں ایسے ہی دو بڑے نام کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے ہیں۔

کشور ناہید جدید شاعری کے حوالے سے ہمارے عہد کا ایک بڑا نام ہے۔ اسکی غزل میں کلاسیکی روایت کا رچاؤ نمایاں ہے۔ مگر اس کی آزاد نظم اور نثری نظم

کے موضوعات جدید اور بے حد چونکا دینے والے ہیں۔ کشور محض رجز خواں نہیں بلکہ میدان جنگ میں اپنے مخصوص اسلحہ سے لیس خود اترتی ہے۔ اس نے خود کو پوری طرح اس معاشرے میں منوایا ہے جہاں عورت کے جمہوری حق حکمرانی اور پوری یا نصف گواہی جیسے مسائل پر تصفیہ طلب بحثیں ابھی تک جاری ہیں اور اس معاشرے میں وہ اپنے جیتے جاگتے وجود کا یوں اعلان کرتی ہے۔

"کشور ناہید'

تمہیں خاموش دیکھنے کی چاہت
قبروں سے امڈی آرہی ہے
مگر تم بولو
کہ یہاں سننا منع ہے
مجھے جن جذبوں نے خوفزدہ کیا تھا
اب میں ان کے اظہار سے
دوسروں کو خوف سے لرزتا ہوا دیکھ رہی ہوں"

کشور کی شاعری میں تمثالیں انکے شعور کے تابع ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ حقیقت ہر فرد کو اس کے ظرف کے مطابق ملتی ہے اور ظرف کی کشادگی یا تنگی کا انحصار خود اسکی اپنی ہمت اور استطاعت پر ہے۔ اور یہ راہ کوئی ایسی سہل بھی نہیں اور وہ کہتی ہے۔

" آزاد رہنے اور زندہ رہنے
اور مرے سوچنے کا خوف
تمہیں کن کن بلاؤں میں گرفتار کرے گا"

(انٹی کلاک وائز۔ ملامتوں کے درمیان)

کشور بطور فرد اپنی معاشرت میں تعلق کی لاتعلقی کو اپنی نظم " رات آتی ہے" میں یوں مصور کرتی ہے۔

دو بستر

ایک ہی کمرے ایک ہی چھت کے سائے میں
ایک پہ بے خوابی کا صحرا
ایک پہ نرم ہوا کے جھونکے
ایک پہ لو کے گرم تھپیڑے
دو بستر
بیچ نہ سال
اور نہ صحرا
پھر بھی ڈونگا لمبا پینڈا

مگر کشور کسی پینڈے سے گریزاں نہیں۔ اسے معلوم ہے کہ اسے ایک غیر انسانی صورتحال کا سامنا ہے اور اسے تبدیل کرنے کیلئے وہ خود بھی احتجاج کرتی ہے اور دوسروں کو بھی احتجاج پر اکساتی ہے۔

"بولنا ہماری ضرورت ہے
چاہے زمین میں منہ دے کر ہی کیوں نہ بولنا پڑے
میری بے گھنی زمین میں منہ دے کر
اپنی صفائی پیش کر رہی ہے
کہ زندگی کے سارے راستوں پر
قاضی شہر کے فیصلے کے مطابق
خوف بچھایا جا چکا ہے"

(تیسرے درجے والوں کی پہلی ضرورت۔ ملامتوں کے درمیان)

کشور کی غزلوں میں کلاسیکیت کے ساتھ ایک ناطہ موجود ہے مگر اسکے ساتھ ساتھ ان میں مضامین کی جدت بھی ہے۔ وہ بیک وقت بڑی مہارت کے ساتھ لمسی، بصری، عضوی، عضلاتی اور سمعی حدوں کو ایک مخصوص امتزاج کے ساتھ کام میں لاتی ہے۔ اسکے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

عمر میں اس سے بڑی تھی لیکن پہلے ٹوٹ کے بکھری میں
ساحل ساحل جذبے تھے اور دریا دریا پہنچی میں
اک مٹھی تاریکی میں تھی، ایک مٹھی سے بڑھ کر پیار
لمس کے جگنو، پلو باندھے، زینہ زینہ اتری میں
لمحہ لمحہ جاں پگھلے گی قطرہ قطرہ شب ہو گی
اپنے ہاتھ میں لڑتے دیکھے، اپنے آپ ہی سنبھلی میں

کشور نے غزل کی تاریخ میں پہلی بار اس صنف کو نسائی لہجہ عطا کیا ورنہ اس سے پہلے تو واقعی غزل مردوں کی عورت سے گفتگو تھی اور وہ بھی بہت حد تک یکطرفہ۔ کشور نے غزل کے ذریعے مردوں سے گفتگو کی جسکی شاید انہیں انکی بہتری کیلئے واقعی ضرورت تھی۔ کشور ایک متحرک اور فعال شخصیت ہے وہ اپنے لئے کام کے نت نئے میدان تلاش کرنا جانتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے فن میں اور بڑھوت ہو گی۔

فہمیدہ ریاض عہد حاضر میں پاکستان کی سب سے متنازعہ ادبی شخصیت ہے عام طور پر ان کا نام سنتے ہی دو انتہائی ردعمل سامنے آتے ہیں۔ (1) جنسی لذت پرستی اور اس پر اسٹیز (2) اس کی سیاسی مہم جوئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسکی شاعری اور نثر پر ان دو انتہاؤں سے ہٹ کر بات کی جائے۔ اس کی پہلی کتاب "پتھر کی زبان" بند پنجرے کے ادب کی عکاس ہے۔ یہ ایک پابندیوں میں جکڑی تو جوان ہوتی ہوئی لڑکی کے جذبوں کی دھیمی دھیمی دکھ کہ "یہاں سننا منع ہے" مگر ان کے شخص کے تسلسل کو سمجھنے میں یہ کتاب بے حد اہمیت کی حامل ہے یہ ابتدا ہے۔ مگر آنے والے کل کا پتہ دیتی ہے اور برصغیر خصوصاً پاکستان کی لوئر مڈل کلاس کی لڑکی کی مسائل کی تفہیم میں مدد دیتی ہے۔

یہ مری سوچ کی ان جانی کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے
اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چھپی

سر جھکائے نظریں کترا کے نکل جاتی ہے

"بدن دریدہ" سے فہمیدہ کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے کتاب کی ابتداء میں Plath سلویا پلاتھ کا ایک اقتباس دیا گیا ہے اسکی اکثر نظمیں Anti Sexist رویئے کی عکاس ہیں اور یہ کہ عورت محض Sex object نہیں ایک انسان ہے عقل رکھتی ہے اور اسکا استعمال بھی جانتی ہے۔ مقابلہ حسن عورت میں جستجو کے جوہر کی اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے ایک بے حد موثر نظم ہے۔ اسی طرح **اقلیما** کا ملاحظہ کیجئے۔

"لمبی رانوں سے اوپر
ابھرے پستانوں سے اوپر
پیچیدہ کوکھ سے اوپر
اقلیما کا سر بھی ہے
اللہ کبھی **اقلیما** سے بھی کلام کرے
اور کچھ پوچھے"

" شہروالو سنو" ہماری سیاسی سماجی اور عمرانی صورتحال کی ایک فکر انگیز دستاویز ہے۔ عورت کے بارے میں مردانہ رویہ یہ ہے کہ اسکا انکار بھی اقرار ہے۔ فلسفیانہ سطح پر یہ مظہریت کی نفی ہے۔ مگر فہمیدہ کا جواب بے حد دلچسپ اور دو ٹوک ہے ۔

"جو میرے لب پہ ہے شاید وہی صداقت ہے
جو میرے دل میں ہے اس حرف رائیگاں پہ نہ جا"

اس کتاب میں کی جانے والی شاعری بنیادی طور پر بند پنجرے کے شعور کی شاعری ہے۔

دھوپ کی اشاعت سے فہمیدہ کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس مجموعہ کی نظموں سے ایک بھرپور عورت ظاہر ہوئی ہے۔ لفظیات میں نئے تجربے کئے گئے اور اسکے گیت بے حد خوبصورت ہیں ۔

"دیکھو ری موری جھولی میں چمکے لعل

گلاب سی سانسیں، کتاب سی آنکھیں، جواب سی کایا جنم سے سوال"

"اپنا جرم ثابت ہے" غالباً" 1986ء کے آخر میں شائع ہوئی اسکی نظموں کے چند عنوانات ملاحظہ کریں۔ کوتوال بیٹھا ہے، سازش، اے دیس مبارک ہو، خانہ تلاش، رلی تیری چھاؤں، چادر اور چار دیواری، نہ صرف یہ کہ اس دور کا ایک جامع استعارہ ہے۔ بلکہ اسکے ساتھ ساتھ اس میں ایک زندہ متحرک اور فعال عورت کے جذبات موجزن ہیں۔ جو پوری توانائی اور جذبے کے ساتھ گلے سڑے ہوئے نظام اور اسکی اقدار کو مسترد کر کے متبادل صحت مند اقدار کا اعلان کرتی ہے۔

"کہ اس زمین پر وجود میرا نہیں فقط اک نشان شہوت
حیات کی شاہراہ پر جگمگا رہی ہے مری ذہانت
زمین کے رخ پر جو ہے پسینہ تو جھلملاتی ہے میری محنت
یہ چاردیواریاں، یہ چادر، گلی سڑی نعش کو مبارک
کھلی فضاؤں میں بادبان کھول کر بڑھے گا مرا سفینہ
میں آدم نو کی ہم سفر ہوں
کہ جس نے جیتی مری بھروسہ بھری رفاقت"

مگر ان کی سب سے اہم کتاب "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے" ہے یہ اردو ادب کا پہلا رزمیہ ہے جو نثری نظم میں لکھا گیا ہے پہلے باب میں شاعرہ باوردی اداروں کا ذکر کرتے ہوئے جیون درست اقدار اور اپنی زمین کیلئے جنگ جاری رکھنے کا اعلان کرتی ہے۔

"میں چلی جا رہی ہوں
ارادوں کو دانتوں میں پیستی
سمیٹتی اپنے منتشر ہوتے وجود کو
جو بار بار بل کھا کر
میری پیشانی کی گرہ بن گیا ہے"

دوسرے باب میں ریاستی اداروں کا تجزیہ ہے۔

"عدالتیں کسی بھی طرح کی ہوں
سرسری ہی ہوتی ہیں
میرے دیس میں"

لیکن جیون دشمن اداروں کے روبرو وہ اپنی بے بضاعتی کے باوجود کہتی ہے۔

"میری آج کی کمزور بے بضاعتی پھلنی
قیامت خیز زلزلوں کا امکان ہے"

اور یہ رزمیہ بند پنجرے کے انہدام کی آس پر ختم ہوتا ہے۔

کشور اور فہمیدہ دونوں کی شاعری میں مرد شاعروں کے من اور تن کا Dilemma مخمصہ موجود نہیں جسے شاہ حسین نے یوں عکس بند کیا ہے۔

من چاہے محبوب کو تن چاہے سکھ چین
دوئے راجہ کی سیدھ میں وہ کیسے بنے حسین

ان کی شاعری میں عورت کی روح ان کے بدن سے الگ نہیں۔ یہ روح اپنے جسم اور اسکی آرزوؤں کو تسلیم کرتی ہے بلکہ شاید یہ وہ ہے جو اپنے جسم کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ انکی شاعری میں اس بات کا گہرا شعور موجود ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کے سبب آنے والے سموں میں یہ دنیا عالمی گاؤں نہیں بلکہ ایک عالمی گھر بن جائے گی اور اس گھر کے سنبھالنے اور سنوارنے کی ذمہ داری آنے والے زمانوں کی نئی عورت پر ہو گی کہ جس کا خواب ان دونوں کا مشترکہ خواب ہے اور یہ کہ خواب ہی حقیقت کو جنم دیتے ہیں۔

لکھنے والیوں کی تنہائی

کشور ناہید

اردو ادب اور ادیبوں کے اس اعتراف کے باوجود کہ ترقی پسند تحریک میں نمایاں افراد میں سے اہم نام ڈاکٹر رشید جہاں کا تھا' عصمت چغتائی پہلی لکھنے والی تھیں۔ جس نے روایتی اسلوب سے ہٹ کر' عورت کے ذہنی اور جسمانی معاملات کو کہانی کی گرفت میں دیا اور اس زمانے میں ناول میں سب سے بڑا نام قرۃ العین حیدر کا ہے مگر آج بھی نثر' نظم اور تنقید لکھنے والی عورتوں کا ذکر ایک پیراگراف کی 13 لائینوں سے آگے نہیں بڑھتا ہے۔ جس میں لہجہ مشفقانہ' نقطہ نظر معشوقانہ اور اساس تحریر' منافقانہ مصروفیت لئے ہوتی ہے۔

پچاس کی دہائی میں سیمون ڈی بوا کی Second Sex کے توسط یہ موضوع زیر بحث آیا کہ لکھنے والی کا بھی اپنا نام' وجود اور ذہن ہوتا ہے اور میری این ایونز کی طرح مرد بنکر اور جارج ایلیٹ نام رکھ کر لکھنے والیوں کو اپنے نام کے ساتھ اعتبار بخشنے کی ہوا ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور اور ممتاز شیریں کی شکل میں برصغیر میں ہویدا ہوئی۔

1993ء کے آخر میں بوسنیا کے 13 سالہ بچے کا لکھا ہوا ناول بعنوان Slaughter's night سال کا Best Seller ناول ثابت ہوا لاری کنگ سے لیکر دنیا کے ہر رسالے اور اخبار نے اس بچے کا انٹرویو شائع کیا اور سوالات پوچھے مگر کسی سوال کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ کیا یہ ناول آپ نے خود لکھا ہے۔

برصغیر میں خاتون لکھنے والیوں کے ساتھ اس سوال کا پتہ کس کس طرح ترازو نہیں ہوا۔ جب ادا بدایونی ٬ ادا جعفری بننے کے بعد' تقریباً" 18 برس تک ادب کے منظر نامے سے غائب رہیں یا رکھی گئیں تو کہا گیا خود لکھتی تو شادی کے بعد بھی لکھتی۔ اب کیوں نہیں لکھتیں۔ جب زہرہ نگاہ نے سولہ برس کی عمر میں آج سے 40

برس پہلے، پورے مشاعرے کی بساط الٹ دی تھی اور لوگ سوائے اس جوان بچی کے، کسی اور کے شعر سننے کیلئے تیار نہیں تھے تو بھی کہا گیا اسکو لکھ کر کون دیتا ہے۔ خالدہ حسین کی کہانیوں کو پڑھنے والے، تنقید لکھنے والے خالدہ حسین کو ادب کے میدان سے 12 برس تک غائب رہنے کو بھی، اپنے اپنے رنگ کے معانی پہناتے رہے۔

فہمیدہ ریاض اور سارا شگفتہ کی شاعری کو امرتا پریتم اور اجیت کور کی شاعری کے ساتھ نتھی کر کے، لذت اور شہوت کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی گئی خود میری کتاب گلیاں دھوپ دروازے پہ مضمون لکھنے پڑے ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اس کتاب کی زیادہ تر نظمیں جنسی نا آسودگی کا اظہار ہیں۔ ہم اور کیا کہیں کہ یوسف کامران بھی تو ہمارا دوست ہے۔

تنقیدی رویوں کی اس جھلک کے بعد، سماجی منظر نامے میں لکھنے والیوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ کیا ہوتا ہے۔ مشاعرے میں شاعرات کو مشاعرے کی زینت بڑھانے اور خاص کر گانے والی شاعرات کو مدعو کر کے مجرے کا متبادل ماحول فراہم کیا جاتا ہے۔ اسی باعث، برصغیر میں گا کر پڑھنے والی زیادہ تر شاعرات مردوں کی ساختہ شاعرات ہیں۔ انکا وجود، خاتون شاعروں کیلئے باعث شرمندگی ثابت ہوتا ہے۔

دیگر مجالس اور تقریبات میں خاتون لکھنے والیوں کو شوہر کے مرتبے کے مطابق درجہ دیا جاتا ہے اور مدعو کیا جاتا ہے غیر شادی شدہ یا اپنے وجود پہ اعتبار کر کے زندگی کرنے والی لکھنے والی ہمدردی اور سکینڈل کے آمیزے میں لپیٹ دی جاتی ہے۔

اب آیئے ادب میں موجود مواد کی طرف ---- 8 مارچ کو خواتین کے عالمی دن پر منعقدہ اسلام آباد میں ایک نشست میں ایک بہت ہی مقبول رومانوی شاعر دوست نے کہا "میں نے خاص عورتوں کیلئے کوئی نظم اس لئے نہیں کہی کہ میری تو ساری شاعری میں مخاطب عورت ہی ہے"۔ گویا محبوبہ سے آگے درجہ دینے کی ضرورت ابھی تک انقلابی شاعروں نے بھی محسوس نہیں کی۔ آنچل کو پرچم بنانے کے نعروں کے زمانے میں بھی مزدور کے استحصال کے خلاف بات کی جاتی تھی۔ مساوات کی بات کی

جاتی تھی مگر عورت کو روایت کے شکنجے سے نکالنے کیلئے کوئی واضح لائحہ عمل نہیں بنایا گیا تھا۔

ہمارے بیشتر مرد لکھنے والوں کے افسانے اور ناول کی ہیروئن کبھی بڑی نہیں ہوتی۔ اسکی کرداری کیفیت میں وہی کتابی اخلاقیات اور المیہ نظر آتا ہے جس نے راشد الخیری کے یہاں جنم لیا تھا۔ کہیں وہ عورت نظر نہیں آتی جسکو بچی کی پیدائش پر گھر سے نکالا جاتا ہے۔ جسکی بچپن میں شادی قرآن شریف سے کر دی جاتی ہے۔ جو نامرد شوہر کے ساتھ ساری عمر ہنسی خوشی زندگی بسر کرتی ہے اور جو جدید زمانے کے الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ لڑکی کے پیٹ میں ہونے کی خبر پہ' پانچ ماہ کا حمل ضائع کرانے کو تیار ہو جاتی ہے یا پیدائش کے بعد' لڑکی کو زہریلے کیکٹس کا دودھ پلا کر مار ڈال دیتی ہے۔

البتہ خاتون لکھنے والیوں نے مرد عورت کے مابین رشتے کی اساس کو خالدہ حسین کی کہانیوں کے انداز میں رشتوں کی گانٹھوں کو کھولنے کی بنیاد ڈالی ہے۔ نوری الہدیٰ کے ذریعہ' وڈیرے معاشرے کے محسنوں میں دبی قبروں کو کھودا ہے۔ الطاف فاطمہ' بانو قدسیہ اور مسرت لغاری کے کرداروں کی زبانی متوسط طبقے کی سفید پوش نوکری پیشہ عورت کی گھر اور باہر کی زندگی کے سلیٹی اور اداس رنگوں کو پینٹ کیا ہے۔ زاہدہ حنا اور ہاجرہ مسرور کے افسانوں کے ذریعہ اندھی کوڑے کھاتی زنا کار کی کہانی سنی ہے اور ناانصافیوں کی دہلیز پہ فرخندہ لودھی یا زیتون بانو کی کہانیوں کی کردار عورت کو والدہ اختر علی خاں کے مقابل مسمات ماہ رخ کہلانے کی جرات دی ہے۔

قیام پاکستان کے حوالے سے زیادہ تر بڑے ناول اور اس دوران عورت پر بیتنے والی کیفیت کو خواتین ناول نگاروں نے ظاہر کیا ہے۔ نثار عزیز بٹ' خدیجہ مستور' قرۃ العین حیدر اور جمیلہ ہاشمی نے ہاتھوں میں ٹھونکی میخوں کو اس طرح قلم نما کیا کہ انکی تحریروں کے اثرات' دو بہت اہم ناول نگاروں یعنی انور سجاد اور عبداللہ حسین کے یہاں خوشیوں کا باغ اور "قید" کی صورت میں علم و استدلال کے روپ میں موجود بہیمانہ تشدد کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواتین لکھنے والیوں اور چند مرد تخلیق کاروں کے توسط معاشرے اور عورت مرد کے مابین رشتے سے متعلق جو سوالات ابھرتے ہیں اور جو منظر نامہ منکشف ہوتا ہے کیا اسکا قارئین اور نقاد کی جانب سے ادراک ہو رہا ہے اور کیا ابھرنے والے سوالات کو نئے اور مبہم ادب کا نام دیکر رد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک اور اہم سوال آج کے معاشرے کے تضادات کو پیش کرنے والے ادب کو کیا مارکینہ کی طرح کے قارئین میسر ہیں کہ ابھی تک خواتین میں بھی رومانوی ادب کو ہی نمائندہ ادب سمجھا جاتا ہے۔

میں جب نازوں پلی کنیرڈ کالج قسم کی اپنی بچیوں سے ملتی ہوں تو ان میں سے بیشتر بڑے ذہین انداز اور استدلال کے ساتھ مجھے کہتی ہیں آپ نے ہمارے لئے زندگی کو مشکل بنا دیا ہے۔ بھلا کون 24 گھنٹوں کے دن کو 36 گھنٹے کا بنا کر، آپ کی طرح دن رات کام کرتا ہے۔ ہمیں تو آرام کی زندگی چاہئے' گرمیوں میں یورپ کی سیر اور شاموں میں نت نئے ریستورانوں کا ذائقہ' ہمیں قبول ہے مرد کی انا کی تسلی کی جائے اور اسکے عوض اپنا آرام اپنا سکون' حاصل کیا جائے۔

ہماری لکھنے والی کو اور ہمارے لکھے ادب کو یہ زندگی قبول نہیں ہمارے معاشرے اور ہماری نوجوان نسل کو ہماری تحریروں میں ناپسندیدہ سچ کی بو آتی ہے۔

لکھنے والیوں کے سچ کو سمجھنے کے لئے' پڑھنے والے اور نقاد کہاں سے آئیں گے۔

سارا میری دوست

عطیہ داؤد

سارا نے خود کشی کر لی۔ سارا مر گئی۔ سارا کے کچھ قریبی دوستوں نے اس کی یاد میں پروگرام کیا۔ اس میں کچھ ادیب نہایت غلیظ الفاظ میں اس کا ذکر کر گئے۔

"تم سارا کو جانتے ہو؟" کوئی پوچھتا تو دوسرا جواب دیتا۔ "نہیں نہیں زیادہ نہیں، بس کبھی کبھار وہ کسی کام کی خاطر میرے گھر آ جایا کرتی تھی۔"

امرتا پریتم نے سارا کی شاعری کے فن کی گہرائی کو پرکھا اور خوب داد دی۔ سارا مر گئی تو ادیب اپنے کاندھوں پر تعریفوں کے جھنڈے لے کر آ گئے۔ امرتا پریتم برصغیر کی اتنی بڑی ادیبہ نے سارہ کو اتنی اہمیت دی جس کو ہم تو کسی خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے۔ ضرور سارا کی شاعری میں کوئی خاص بات ہو گی۔ پھر تو ہر طرف سارا سارا ہو گئی اور سارا بے چاری تو تمام عمر اسی محبت اور عزت کی آس دل میں لے کر دنیا سے چلی گئی۔

سارا بکھرے کاغذات کی طرح ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی، امرتا پریتم نے پوری سچائی کے ساتھ چاہا کہ اسے اس طرح واضح کر دے جس طرح اس نے خود کو کیا ہے۔ اس نے اپنے اندر کی سچائی کی وجہ سے سارا کی ہر بات پر فقط اعتبار کیا ہے۔ مگر اک باشعور ادیبہ ہونے کے ناطے ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ عقل میں نہ آنے والے من گھڑت واقعات پر شعوری طور پر نظرثانی کریں۔

ہمارے کئی دوستوں کا خیال ہے کہ سارا کی خامیوں کو ہمیں عیاں نہیں کرنا چاہئے کہ اب تو وہ مر گئی۔

سارا کی دوست کی حیثیت سے میں اسے آج بھی اس قدر پیار کرتی ہوں، دل چاہتا ہے کہ دوستی کی چادر میں اسے لپیٹ کر سینے سے لگا لوں۔ دنیا کی

خراب نظروں سے چھپا لوں کہ اسے کوئی برا نہ سمجھے۔ کوئی بھی کم تر نہ کہے۔ مگر سارا فقط میری نہیں ہے' اس کی شاعری تاریخ میں تب تک زندہ رہے گی جب تک ظلم جبر اور نا انصافی ہے۔ اگر مجھے فقط اس کی شاعری پر لکھنے کے لئے کہا گیا ہوتا تو میں بھی ضرور اس کی ذاتی زندگی پر لکھنے سے کنارہ اختیار کر لیتی مگر یہ کتاب "اک تھی سارا" جس کا دیباچہ لکھنے کے لئے مجھے کہا گیا ہے۔ یہ سارا کی آپ بیتی ہے۔ اس میں سارا نے خود اپنے لئے اتنی متضاد باتیں کی ہیں کہ اگر آج ہم ان پر پردہ ڈال بھی جائیں تو کیا ہو گا؟ سارا آنے والی نسلوں کی بھی تو شاعرہ ہے۔ جب آنے والی نسل اپنے عقل اور شعور کی روشنی سے ان واقعات کو دیکھے گی اور موازنہ کرے گی تو کیا ہو گا۔

کل سارا کا کوئی بھی دوست زندہ نہیں ہو گا۔ اس لئے کوئی بھی وضاحت نہیں کر سکے گا۔ میں سوچتی ہوں کہ کیوں نہ ہم سارا کو اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت آنے والی نسلوں کے حوالے کر جائیں۔ وہ خود ہی اس کو انصاف کے ترازو میں تول کر دیکھ لیں۔ اس کے ایک پلڑے میں سارا کی زندگی رکھ لیں دوسرے پلڑوں میں سارا کی شاعری رکھ کر دیکھ لیں۔ میرا اعتماد ہے کہ سارا کی شاعری والا پلڑا ہر دور میں بھاری رہے گا۔

سارا جس طرح کی زندگی گزارتی تھی' ذہنی طور پر خود بھی اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ اس لئے ہمیشہ گلٹ کے احساس میں رہتی تھی اس کی شاعری میں اسی گلٹ کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایسی زندگی کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خود سے چمٹائے ہوئے چلتی تھی۔ اک نظم میں وہ کہتی ہے۔

"مجھے روٹی دو اور پھر گالی دو"

سارا تضادات کا شکار تھی۔ اس کو درد نے نہیں مارا مگر اس کو اپنے ہی اندر کے تضادات نے مار ڈالا۔

سارا کو معلوم تھا کہ جس طرح کی وہ زندگی گزارتی ہے وہ عزت کے قابل نہیں اور اس کے لئے عزت بھری زندگی گزارنے کا یقیناً ایک پیمانہ بھی تھا جس میں وہ خود کو فٹ نہیں کر پاتی تھی اور پھر ایسی عورتوں کو جن کو وہ اچھا سمجھ رہی ہے

ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہے۔

دیکھو! میرے اسباب میں نہ روح رہی ہے نہ کوئی بدن میں آج بہت اذیت میں ہوں۔

وہ عزت جو کنواریوں پر لازم ہے مجھ پر نہیں اور سوچ کے انہی تضادات نے سارا کو جھوٹ بولنا سکھایا۔ وہ اپنی خامیوں کو درد کی پڑیوں میں ڈال کر پیش کرتی تھی۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے روزمرہ کی زندگی میں کئی جھوٹ بلاوجہ بھی بولتی رہتی تھی۔

وہ مجھے بہت پیار کرتی تھی باتوں باتوں میں اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میرا جنم دن فسٹ اپریل کو ہے۔ کہنے لگی کہ تمہارا جنم دن دھوم دھام سے مناؤں گی۔ میں ہنس پڑی کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس کے پرس میں دو روپے رکھے ہیں۔ فسٹ اپریل کی صبح کو اس نے مجھے کہا کہ مجھے بیس روپے دو میں جا رہی ہوں۔ میں نے اسے بیس روپے دیئے اور دل میں شکر ادا کیا کہ وہ بھول چکی ہے۔ سالگرہ والی بات بھول چکی ہے۔

دوپہر کو ایک دو بجے کے قریب وہ ٹیکسی میں گھر آئی ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپنگ کے تھیلے، مرغ، اور کپڑے لے آئی تھی۔ کہنے لگی کہ کچھ دوستوں کو دعوت دی ہے وہ بھی آئیں گے۔ میرے لئے سبز کلر کا ریشمی سوٹ لے آئی تھی اور اس پر سنہرے رنگ کا بروکیڈ کا دوپٹہ اور زرق برق چوڑیاں۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔ میں سخت غصے میں آ گئی۔ تجھے معلوم ہے کہ میں ایسے کپڑے نہیں پہنتی اور یہ چوڑیاں ____ کبھی تم نے مجھے چوڑیاں پہنی ہوئی دیکھی ہیں۔ میرے ڈانٹنے پر وہ ڈھیلی سی ہو گئی۔ روہانسی ہو کر سگریٹ پینے لگی۔ مجھے احساس ہوا۔ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور کہا Sorry اور وہ دوبارہ خوشی سے بھول گئی اور جلدی جلدی دوسرے شاپنگ بیگ کھولنے لگی۔ بندے اور نیکلس کپڑوں کے میچنگ بھی نکال کر دکھانے لگی۔ میں نے اپنے غصے کے لہجے کی سختی کو نرمی میں بدلتے ہوئے آہستگی سے کہا کہ سارا تم اتنے سارے پیسے کہاں سے لائی۔ کہنے لگی دیکھ میری زندگی میں ایسے بہت کم

پل آتے ہیں کہ میں خوش ہو جاؤں۔ مجھے خوش ہونے دو۔ ڈانٹو مت۔ میں چپ ہو گئی اور وہ ناچنے لگی۔

شام کو اس نے مجھے دلہنوں کی طرح تیار کیا۔ ایک ایک چیز مجھے پہنانے کے لئے دے رہی تھی اوپر پھر جب آخر میں الماری کھول کر گلاب کے پھولوں کے گجرے لے آئی میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ مذاق کرتے ہوئے اسے کہا۔ "سارا تم میری آج کہیں شادی تو نہیں کروا رہی ہو" اس نے جواب دیا۔ میں ایسے کیسے کر سکتی ہوں ہاں مگر خیالوں میں ہی تجھے دلہن بنا رہی ہوں کیونکہ مجھے ایسے لگتا ہے کہ تجھے اپنی زندگی میں کبھی دلہن کے روپ میں دیکھ نہیں پاؤں گی"۔ وہ جو ہمیشہ جھوٹ بولتی تھی نہ جانے کیوں مجھے اس کے اس جملے کی سچائی پر اعتبار آگیا اور میں نے کہا "سارا اگر میں دلہن بنی تو تمہارے ہاتھوں ہی بنوں گی" ورنہ سارا نے جملہ ادھورا چھوڑا۔ میں نے کہا "شادی کی بھی تو دلہن نہیں بنوں گی" اور پھر ایسا ہی ہوا خدا بخش آبڑو جیسے حساس انسان نے میرا قول نبھایا۔ مجھے روایتی دلہن بننے پر مجبور نہیں کیا۔

میری سالگرہ کے دوسرے دن جب سارا ابھی سو رہی تھی کمرے کی صفائی کرتے ہوئے مجھے کچھ چٹھیاں ملیں۔ جن کو فیئر کرنے کے بعد اس نے رف کاغذات کی طرح مروڑ تروڑ کر اس نے وہیں پھینک دیا تھا۔ ان کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

"فلاں صاحب! رات اچانک میرے بھائی کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے ـــــــ بھائی کو دل کا دورا پڑا ہے۔ میری بہن سخت بیمار ہے ـــــــ میری بیٹی بیمار ہے وغیرہ اس لئے اتنے پیسے چاہئیں۔ قرضہ دے دیجئے ضرور واپس کروں گی اور بس کہ خدا جانتا ہے کہ میں بہت خوددار ہوں لیکن سخت ضرورت پڑ گئی ہے ورنہ کبھی بھی نہیں مانگتی۔" یہ چٹھیاں پڑھ کر مجھے دکھ ہوا۔ لیکن اب میں کیا کر سکتی تھی۔

اک بار میری دوست ساجدہ قریشی کی بیٹی کی سالگرہ تھی۔ میں اور ثروت اس کے پاس رات کو گئے۔ صبح کو سارا ہمارے گھر گئی گھر پر اماں نے بتایا تو وہ ساجدہ کے گھر آ گئی۔ وہ بہت رو رہی تھی لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ہچکیوں کے دوران اس

نے بتایا کہ اسلام آباد میں اس کی بیٹی شیلی فوت ہو گئی ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر بہت روئے اور ساجدہ محلے میں سے کسی سے ادھار پیسے لے آئی اسے جہاز کا ٹکٹ لے کر دیا۔ مگر سارا کی ضد تھی کہ مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے کوئی نہیں چلے گا۔ میں اکیلی ہی جاؤں گی۔ ٹکٹ ملنے کے بعد اس نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اچھے سے کپڑے پہنے میک اپ کیا اور چل دی۔ دس پندرہ دن کے بعد واپس آگئی ہم نے پوچھا تو کہنے لگی کہ اچھا وہ ہاں وہ میری بیٹی نہیں مرگئی تھی محلے کی کوئی بچی مرگئی تھی۔

سارا تمام دوستوں سے ایسی ہی من گھڑت باتیں کرتی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کون کس طرح کی بات سے متاثر ہو سکتا ہے۔ ایک بار جب میری ماں نماز پڑھ رہی تھی تو سارا بھی ان کے قریب جاء نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ اماں نماز پڑھ چکیں تو اماں سے گلے مل کر بہت روئی اور کہا کہ اماں میرا شوہر مجھے نماز پڑھنے سے روکتا تھا۔ ماں نے کہا ہائے! اتنا ظلم پھر تو اماں اور سارا دونوں ہی رو رہی تھیں۔

سارا کو سب معلوم تھا کہ امرتا پریتم کس طرح کی کہانی سے دکھی ہو سکتی ہے۔ مگر امرتا پریتم جیسی اچھی رائٹر پر لازم تھا کہ سارا کی تحریروں کا شعوری طور پر تجزیہ کرتیں۔

اس کتاب میں صفحہ (28 سے 31) شوہر سے بچے مانگنے کے لئے جانا۔ ایک طرف وہ لکھتی ہے کہ میانوالی میں نہ تو رکشہ چلتا ہے اور نہ ہی کوئی اور سواری پھر بھی وہ وہاں جہاز میں جاتی ہے اور ہوٹل میں ٹھہرتی ہے۔

سارا کے بچوں کا کہنا ہے انہیں باپ کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔

(صفحہ 54 سے 55 تک) دو مشاعروں کے درمیان جو لڑائی کا منظر دکھاتی ہے کہ شوہر کے سامنے فقط دوسرے شاعر کو خوبصورت کہنے پر اسے طلاق ہو جاتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ طلاق ہونے کا سبب اس وقت یہی تھا کہ وہ جسمانی تعلقات رکھنے میں ہیروئن کے نشے کی طرح عادی تھی۔

اس کتاب کے صفحہ 42 پر سارا کورٹ میں دیئے ہوئے بیان کا واقعہ سناتی ہے۔ ہیومن رائٹس تنظیم کا مشہور وکیل ضیا اعوان اس بیان پر اپنی آراء دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "پاکستان کے قانون کے مطابق اگر کوئی عورت جج صاحب کے سامنے اس طرح کا بیان دے یا ایسا اعتراف کرے کہ میں آوارہ اور بد چلن ہوں اور یہ بچے اس شوہر سے نہیں ہیں بلکہ ان کا باپ کوئی اور ہے تو اس صورت میں اس عورت کو سنگسار کرنے یا اس سے بھی کوئی اور سخت سزا ہو سکتی ہے ممکن ہی نہیں کہ جج کے آگے عدالت میں اس طرح کا بیان دے کر اور بدچلنی کا اعتراف کر کے کوئی عورت باعزت بری ہو جائے۔" یاد رہے کہ وہ دور ضیا کی مارشل لاء اور خاص طور پر عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین کے حوالے سے بد ترین دور تھا۔

سارا نفسیاتی مریض تھی اس کا تھوڑا بہت علاج بھی ہوا تھا۔ اسے بجلی کے جھٹکے بھی لگے تھے۔ کوئی نہ کوئی اسے ہسپتال داخل کرا دیتا تھا۔ لیکن وہ موقعہ پاتے ہی وہاں سے بھاگ جاتی تھی۔ کیونکہ ہسپتال کا ڈسپلن عملے کی بے حسی اس کے برداشت سے باہر تھیں۔ ہسپتال سے بھاگ جانے میں اسے سکول کے شرارتی بچے کی طرح مزا آتا تھا۔

سارا پر دردوں کا اکثر ایسا دورہ پڑتا تھا کہ وہ سارے ماحول کو سوگوار بنا دیتی تھی میں اور ثروت اکثر اس کے جھوٹ پر لگ جاتے تھے۔ اسے ڈانٹ بھی دیتے تھے مگر جب آنسوؤں کی لڑیاں اس کی آنکھوں سے مسلسل برستی رہتیں تو ہم سب جانتے ہوئے بھی اس کے ساتھ رونے لگتے تھے۔

ایک بار سارا کی طبیعت خراب ہو گئی قے کرنے لگی اور قے میں خون آ گیا۔ میں اور ثروت اسے جناح ہسپتال میں میرے بھانجے ڈاکٹر زاہد کے پاس لے گئے۔ زاہد نے چیک اپ کر کے آہستہ سے کہا اسے "السر" ہے۔ یہ سن کر ثروت رونے لگی۔ میں نے ثروت کو جو روتے ہوئے دیکھا تو خود بھی رونے لگی۔ زاہد نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ "تم ایسی بچوں کی سی حرکتیں کیوں کر رہی ہو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟" میں نے ثروت کی طرف اشارہ کیا کہ یہ کیوں رو رہی ہے۔ تب

ثروت نے کہا "زاہد کہہ رہا ہے کہ سارا کو کینسر ہے" اور پھر زاہد نے ہنستے ہوئے بتایا کہ میں نے کینسر نہیں السر کہا ہے۔ زاہد نے سارا کو ہسپتال میں داخل کیا۔ خالہ سمجھ کر اس کی خدمت کی پورا خیال کیا لیکن دوسرے دن صبح سویرے سارا گھر پہنچ گئی اور کہا کہ مجھے وہاں کوئی لکھنے نہیں دے رہا تھا۔ سگریٹ بھی پینے نہیں دے رہا تھا۔

ہم سب دوست سارا کی بیماری کی وجہ سے سخت پریشان ہوتے تھے مگر ہم میں سے یہ کسی کے بھی بس کی بات نہیں تھی کہ اس سے اپنی بات منوا سکتے۔ بہت سے سگریٹ پھونکنا' کھانا کم اور کبھی بہت زیادہ کھانا' بہت زیادہ جاگنا' اور پھر نیند آور گولیاں کھانا اور سارا سارا دن سوتے رہنا۔ جنسی بے راہ روی کی عادت' اس پر شرمندگی کی وجہ سے شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو جانا۔ اپنے آپ کو اچھا اور سچا ثابت کرنے کے لئے جہاں اپنی کوئی اچھائی ثابت نہ کر سکتی ہو وہاں اپنے لئے من گھڑت واقعات بنا کر خود کو ٹریجک شخصیت بنانا اور پھر ہمیشہ اس جھوٹ کے کھل جانے کا خوف دل میں کانٹے کی طرح چبھتا ہوا محسوس کرنا' شاعری کی وہ داد حاصل نہ کر سکنا' ادبی حلقوں میں ادیبوں کی نظروں سے اپنے سینے پر طنز کے سینکڑوں تیر سہنا۔ یہ تمام باتیں ایک انسان کو مرنے پر مجبور کرنے کے لئے کیا کافی نہیں ہیں؟

سارا کی جنسی بد لحاظی دراصل اس کی نفسیاتی بیماری تھی اس بیماری کا نفسیاتی ماہروں کے پاس علاج بھی ممکن تھا مگر سارا کا علاج کون کرواتا؟ اس کے قریبی دوست مشہور ترقی پسند ادیب' شاعر اور دانشور اپنی ہوس کی آگ بجھاتے۔ مزے لیتے رہے اور اسے کہتے رہے کہ "سارا تم عظیم انقلابی عورت ہو' ٹکے ٹکے کی باتیں ہم جیسے دانشوروں کی سوچ اور شان کے خلاف ہیں۔ ہماری مرضی ہی بہت بڑی بات ہے۔"

ان دانشوروں اور شاعروں میں سے کئی ایسے بھی تھے جو گھر سے باہر جاتے ہوئے بیوی کو گھر میں تالے میں بند کر جاتے تھے اور ان کی بیویاں مرد تو کیا ادبی دنیا کی عورتوں کے سامنے بھی چائے لے کر نہیں آتی تھیں۔

سارا کا تمام سرکل لے دے کر وہی تھا۔ وہ گھوم پھر کر بھی انہی کے پاس

جاتی تھی۔ اس لئے انہی کی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ جاتی تھی۔ مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر شفا نعیم ایسی عورتوں کے کیس اسٹڈی کے متعلق بات کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ کوئی عورت اگر جنسی بے لگامی پر اتر آئے تو اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ بچپن میں اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی ہو یا فقط ایسی کوشش کی گئی ہو۔ بچپن کی شادی' بالغ ہونے سے پہلے ہی جنسی تجربہ' باپ کے پیار سے محرومی' خود کو غیر محفوظ سمجھنا' یہ تمام یا ان میں سے کوئی وجوہات ہو سکتی ہیں ان کا علاج ہو سکتا ہے خاص طور پر ایسی عورتوں کا علاج اور آسان ہو جاتا ہے جو اس عمل میں اپنے اندر گلٹ کا احساس رکھتی ہیں۔

ان تمام ادیبوں' شاعروں' دانشوروں اور صحافیوں نے ڈھیر ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں کیا انہیں ایسی عورت کی نفسیات کے متعلق علم نہیں تھا؟ مگر ہر ایک کا مقصد آم کھانے سے تھا گٹھلیاں کون گنتا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر بات ظاہر ہو بھی گئی تو ہم مردوں کو کوئی کیا کہے گا۔ تاریخ کے کٹہرے سے باعزت بری ہو جائیں گے خراب تو فقط یہ ہی عورت سمجھی جائے گی۔

سارا ایسے لوگوں کے کھوٹے من سے واقف بھی تھی۔ سارا کا عمل قابل مذمت ہے اور نفرت انگیز بھی ہے۔ مگر پھر وہ مرد نفرت کے قابل کیوں نہیں ہیں۔

سارا ایسے ہی مشہور دانشوروں کا کچھ دیر کے لئے ہی سہی مگر ان کی گردن اپنے پاؤں پہ جھکا کے فخر اور اذیت کے ملے جلے احساس کے ساتھ کہتی ہے۔

میرے پستانوں میں سے یہ کیسا
کھوٹا سکہ چل نکلا ہے کہ
میں جب چاہوں تجھے خرید سکتی ہوں

سارا جانتی تھی کہ اگر اس نے اصل داستان بتانے کی کوشش کی تو سماج اسے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اس لئے اس نے درد ناک اور من گھڑت قصے گھڑے۔

سارا نفسیاتی مریضہ تھی لیکن کیا کیجئے کہ یہاں تو ساری سوسائٹی ہی

نفسیاتی مریض ہے۔ حساس دل شاعروں' دانشوروں بڑے ترقی پسند رائٹرز کی زندگی کیا کرہت آمیز نہیں جو ایک لاش سے بھی مزے لینے سے باز نہیں آتے تھے۔

سارا کے ساتھ میں نے کوئی زیادہ وقت نہیں گزارا۔ 1980ء میں جفاکش رسالے کے دفتر میں احمد سلیم کے پاس سارا کے ساتھ ایک سرسری ملاقات ہوئی۔ احمد سلیم اور ثروت اکثر سارا کی باتیں مجھ سے کرتے۔ احمد سلیم نے امرتا پریتم کا پیغام پہنچایا کہ وہ یہ چاہتی ہیں کہ سارا عطیہ کے پاس رہے۔

ایک دن ثروت اور میں سارا کے گھر چلے گئے۔ سارا پہلے سے گھر والوں سے لڑ کر اپنا سامان باندھ کر بیٹھی ہوئی تھی کتابوں کی ایک بہت بڑی پوٹلی کپڑوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی یہ اس کا کل سامان تھا۔ وہ میرے ساتھ رہنے پر تیار ہو گئی۔ یا دوستوں نے اسے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کیا تھا۔

سارا میری ماں سے بہت پیار کرتی تھی۔ اماں سے لپٹ کر رو کر اپنی داستانیں سناتی اور کبھی اسے اس طرح کی دلداریاں دیتی کہ آپ دل میں کوئی فکر نہ کریں میں عطیہ کی شادی دھوم دھام سے کراؤں گی۔ باہر شامیانے لگاؤں گی۔ میں آفس سے آنے کے بعد اماں سے سارا کے بارے میں اس طرح پوچھا کرتی تھی جیسے اب اپنی بیٹی کے لئے پوچھتی ہوں۔ سارا نے کھانا کھایا؟ الٹیاں تو نہیں کیں؟ سارا وقت کیا کرتی رہی؟ کہیں گئی تو نہیں؟ روئی تو نہیں؟ اور اکثر اماں مسکراتے ہوئے بتاتی کہ آج اسے برتن دھونے کا دورہ پڑا۔ دیکھو کتنے صاف برتن دھوئے ہیں۔ بالکل قلعی کر دیئے ہیں۔ مگر وم کا ڈبا پورا ختم۔ یا آج سارا کو کپڑے دھونے کا دورہ پڑا تھا اسے میلے کپڑے نظر نہیں آئے تو تمہارے دھلے ہوئے اٹھا کر انہیں دوبارہ دھو لیا۔ دیکھو کتنے چمک گئے ہیں۔ مگر سرف کا پورا ڈبا ختم۔ آخری جملہ اماں اکثر آہستہ کہتیں لیکن پھر بھی اکثر سارا سن ہی لیتی تھی اور پھر مجھے مناتے ہوئے کہتی کہ تم پریشان مت ہو میرے پاس پیسے آ جائیں گے تو پھر ہم بہت ساری سرف اور وم لے آئیں گے میں ہنس کر کہتی کہ ہاں ہم پورا کچن وم سے اور باتھ روم سرف سے بھر دیں گے ٹرک میں لاد کر لائیں گے اور پھر وہ موڈ میں آ جاتی تھی کہتی تھی کہ "عطیہ تمہارے کپڑے

بہت سادے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے اتنی بڑی شاعرہ کی کیسی دوست ہے۔ میں تجھے بہت سارے اچھے کپڑے لے کر دوں گی۔ انڈیا لے جاؤں گی۔ انڈیا میں میری بہت عزت ہے۔ امرتا پریتم میری پکی سہیلی ہے۔ سب سے کہہ دوں گی کہ عطیہ کی بھی کتاب چھپواؤ اور اسے بھی مشہور کرا دو وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔"

ایک بار مجھے اور ثروت کو ایک مشہور شاعر کے گھر لے جانے کے لئے ضد کرنے لگی۔ ہم نے بہت ٹالا مگر ہماری ایک نہیں سنی۔ ہم اس کا دل رکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے ہمیں ایک ایک موٹی سی کتاب ہاتھ میں پکڑنے کے لئے دی۔ ہم نے پوچھا یہ کیوں؟ کہنے لگی کہ اچھا لگتا ہے۔ امپریشن اچھا پڑتا ہے لوگ سمجھیں گے پڑھی لکھی لڑکیاں جا رہی ہیں۔ ہم ہنسنے لگے۔

شاعر کے گھر گئے۔ ادبی نشست کا سماں تھا۔ ہمیں اس طرح دیکھا جا رہا تھا جیسے ہم انار کلی کی سہیلیاں ہوں اور اکبر بادشاہ کے دربار میں انار کلی کے ساتھ چلے گئے ہوں۔ ثروت اور میں ماحول کو بھانپ کر اٹھ کھڑے ہوئے سارا کو کہا چلو ہم جا رہے ہیں۔ سارا نے کہا ایسے کیسے جاؤں گی میں تو اپنی شاعری سناؤں گی۔ پھر میں اور ثروت چلے آئے۔

سارا میں اس طرح کی عادتیں تھیں۔ اس کی یاد داشت جو اب دے جاتی تھی، ہر بات بھول جاتی تھی، کبھی بہت زیادہ کھانا کھاتی تھی۔ کھانا کھا کر ہاتھ بھی نہیں دھوئے ہوئے تو کہتی کہ قسم سے میں نے کل سے کھانا نہیں کھایا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے اور کبھی سارا سارا دن کھانا نہیں کھاتی تھی۔ سگریٹ بہت پیتی تھی اس کا برانڈ "میلبرن" تھا سارا ایش ٹرے بھر دیتی تھی اور پھر بے خیالی میں ہاتھ لگا کر اسے گرا دیتی تھی، اکثر سگریٹ پیتے ہوئے اپنے کپڑے اور بستر جلا دیتی تھی۔ میں ڈر کے مارے سو نہیں پاتی تھی کہ کہیں وہ خود کو بے خیالی میں جلا نہ دے کیونکہ اسے اکثر اس حالت میں نیند آ جاتی تھی کہ عینک پہنی ہوئی ہے، جلتا ہوا سگریٹ اس کی انگلیوں کے درمیان پھنسا ہوا ہے یا کبھی ہونٹوں پر ہے۔ میں اس کے ہاتھوں سے سگریٹ لے کر اس کی عینک اتار کر اس کے اوپر چادر اڑھا کر پھر ریلیکس ہو کر سو جایا

کرتی تھی۔ ایک بار مجھے نیند آ گئی تو اماں نے آ کر اٹھایا کہ تمہارے کمرے سے جلنے کی بو آ رہی ہے۔ دیکھا تو بستر کے موٹے سے گدے کا اچھا خاصا حصہ جل چکا تھا۔ پھر تو مجھے بہت خوف آتا تھا۔ میں اکثر اس طرح کے خواب دیکھا کرتی تھی کہ سارا جل رہی ہے۔ چیخ رہی ہے۔

سارا روڈ کراس کرتے ہوئے بہت کنفیوز ہو جایا کرتی تھی اور اوپر سے اس کی یہ بھی ضد ہوا کرتی تھی کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر تجھے بھی میں روڈ کراس کراؤں گی ورنہ گاڑیاں تمہارے اوپر آ جائیں گی۔

سارا اکثر ہم سے سعید احمد کی باتیں کرنے لگتی مگر ہم یہ سوچ کر ہنستے کہ یقیناً یہ بھی کوئی فرضی کردار ہو گا۔ ایک بار سارا کی کاغذات پر کہیں کونے میں سعید احمد کا فون نمبر لکھا ہوا نظر آ گیا۔ میں نے PCO سے جا کر فون ملایا۔ کہا سعید احمد سے بات کرنی ہے۔ آواز آئی "میں بول رہا ہوں" فوراً" میں نے فون رکھ دیا حیرانی ہوئی کہ پہلی بات سارا کی سچ ہوئی۔ لیکن اس بات کا سارا سے ذکر نہیں کیا۔

ایک بار سارا کی طبیعت خراب ہوئی پریشانی ہوئی کہ سارا کو کیسے سنبھالا جائے۔ سعید احمد کو فون کیا۔ سعید آ گئے۔ اب سارا ناراض ہو گئی کہ تم نے سعید کو کیوں بلایا۔ غصے میں سامان توڑنے لگی۔ میں نے ناراض ہونے کے بجائے اس کے کان میں جا کر کہا "سارا تم تو جانتی ہو میں غریب ہوں۔ سامان توڑو گی دوبارہ لے بھی نہیں سکوں گی۔" سارا ایک دم نارمل ہو گئی۔

سارا مستقل میرے پاس نہیں رہتی تھی۔ کبھی مہینے مہینے تک نہیں آتی تھی۔ انہی دنوں میرے بھائی جو بحرین میں تھے مجھے اور اماں کو بحرین بلایا۔ دو سال کا ویزا بھیجا۔ میں خوش تھی کہ بھتیجوں سے ملاقات ہو گی ایک ہفتے کے اندر مجھے شاپنگ سمیت تمام تیاری کرنی تھی۔ سارا کو بہت ڈھونڈا اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ تو تھا ہی نہیں کہاں ڈھونڈا جائے۔

ایک دن اچانک جب میں شاپنگ کر کے گھر آئی تو دیکھا سارا گھر میں بیٹھی ہوئی رو رہی ہے۔ اماں نے اسے ہمارے جانے کی بات بتا دی تھی۔ میں 17 مئی

کو جا رہی تھی۔ اپریل میں میرے جنم دن پر سارا نے جو مجھے کتابیں پریزنٹ کی تھیں وہ بھی لے جانے کے لئے الگ کر کے رکھ دیں تھیں۔ نہ جانے کب سارا نے اس میں وہ جو آخری خط ثابت ہوا رکھ دیا۔

ایک تو سارا کو ڈھونڈنے میں بہت مشکل ہوئی تھی اب جو اسے روتے ہوئے دیکھا تو مجھے غصہ آگیا۔ اس دن جب میں نے آخری بار سارا کو دیکھا اس نے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور گلابی میچنگ کے موتیوں والے بندے' وہ کپڑے بھی نئے تھے۔

سارا نے کہا عطیہ میرے پاس بیٹھو۔ میں نے بے زاری سے کہا۔ کہو کیا کہتی ہو میں سن رہی ہوں۔ سارا نے روتے ہوئے کہا۔ عطیہ پلیز تم مت جاؤ۔ کیوں میں کیوں نہیں جاؤں۔ میں نے غصے سے کہا۔ کیونکہ وہ بہت دنوں سے نہیں آئی تھی اس لئے میں غصے میں بھری ہوئی بیٹھی تھی۔

میں نے کہا۔ بول میں کیوں نہیں جاؤں۔ تم میری دودھ پیتی ہوئی بچی ہو۔ میرے بغیر مرجاؤ گی۔

کہنے لگی۔ ہاں۔ عطیہ میں سچ کہتی ہوں میں مرجاؤں گی۔

میں نے اسے سمجھایا کہ یہ اب میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ کہنے لگی میں ایک گھنٹے میں آتی ہوں۔ میری دوسرے دن کو ہی فلائٹ تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ میرے لئے تحفے تحائف لینے کے لئے جا رہی ہے۔ اسے بہت سمجھایا کہ میری اب تو تقریبا" پیکنگ ہو گئی ہے۔ مزید سامان لے جانے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ تم مت جاؤ۔ آج ہم فقط باتیں کریں گے مگر تحفے دیئے بغیر اس کا دل کب مانتا تھا۔ وہ ایک گھنٹے کا کہہ کر چلی گئی۔ مگر وہ جھوٹی کہیں کی پھر کبھی نہیں آئی۔ میں نے گھر کو تالا لگاتے ہوئے کئی بار مڑ کر دیکھا۔ ایئرپورٹ پر بھی ہم اسی آس میں رہے کہ شاید آ جائے۔

7 یا 8 جون کو میں نے وہ کتاب پڑھنے کے لئے نکالی تو اس میں سے وہ خط نکل آیا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ اب میں تجھے بک شیلف میں سجی ہوئی

کتاب کے طور پر ملوں گی۔ سارا سے آخری ملاقات، جملے اس کی وہ الوداعی نظریں سب مجھے یاد آ گئے۔ نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ سارا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ میں نے دوستوں کو خط لکھے کہ صحیح صحیح سارا کے متعلق بتا دو اور پھر مجھے ثنا کا خط ملا کہ حوصلہ رکھو اور ساتھ میں اخبار کی کٹنگ بھی کہ کس طرح وہ الوداع کہہ گئی۔

سارا اکثر کہتی تھی کہ عطیہ تم مجھے کوئی تحفہ کیوں نہیں دیتی ہو۔ میں اس وقت کوئی تحفہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ بحرین سے واپسی پر جب میرے بھائی نے خوب شاپنگ کروائی تو ہر چیز کپڑا، پرفیوم، جیولری خریدتے ہوئے مجھے سارا بہت یاد آ رہی تھی۔ اب یہ تمام چیزیں اسے گفٹ کر سکتی تھی مگر اب سارا نہیں ہے۔ بحرین سے ٹیپ ریکارڈ لے آئی تھی سارا موڈ میں آ کر اکثر کمرے میں گاتے ہوئے ناچتی تھی۔

میں تو پریم دیوانی رے

کہتی تھی عطیہ ہم ٹیپ ریکارڈر ضرور خریدیں گے اب اس کے کمرے میں ٹیپ ریکارڈر موجود تھا مگر وہ خود کبھی دوبارہ اس کمرے میں نہ آئی۔ بحرین سے واپسی پر سعید کے ساتھ سارا کی قبر پر گئی تھی وہاں روتے روتے میں اچانک ہنس پڑی تھی سعید نے پریشان ہو کر مجھے دیکھا تو میں نے اسے بتایا کہ دراصل مجھے نصابی کتاب میں لکھی ہوئی جھوٹے چرواہے کی کہانی یاد آ رہی ہے کہ جعفر نامی ایک لڑکا روز لوگوں کو بے وقوف بناتا تھا کہ میری بکریاں بھیڑیا کھا رہا ہے جلدی کریں میری مدد کریں اور لوگ لاٹھیاں لے کر بھاگتے ہوئے اس کی مدد کو جاتے تو وہ انہیں دیکھ کر ہنستا تھا اور کہتا میں مذاق کر رہا تھا ایک بار سچ مچ بھیڑیا اس کی ساری بکریاں کھا گیا اس بار جعفر بہت چلایا مگر کسی نے اس کا اعتبار نہیں کیا اور کوئی اس کی مدد کو نہیں گیا۔

تو سارا تیرے جھوٹ بولنے کی عادت کی وجہ سے میں نے تم پر اعتبار نہیں کیا مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم سچ مچ مجھے روک رہی ہو تو میں تمہاری بات ضرور مان لیتی۔

سعید۔ سارا کے لئے ابھی تک روتا ہے۔ سعید سارا سے اس وقت ملا تھا جب سارا کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ سعید کو معلوم تھا کہ سارا جھوٹ بولتی ہے مگر وہ پھر بھی اسے عزت دینے کے لئے اس کی ہر بات پر اعتبار کرتا تھا وہ سارا کی تمام عادتوں سے اچھی طرح واقف تھا اور اس نے سارا کو شادی کی آفر کی تھی مگر کیونکہ وہ شادی شدہ تھا اس لئے سارا نے کہا تھا کہ وہ کتنی ہی بری عورت کیوں نہ سہی مگر خود کسی عورت کا گھر نہیں اجاڑے گی سعید ایک خوشحال آدمی ہے اس نے سارا کے نام اچھی رقم الگ کر کے رکھی تھی وہ سارا کو دینا چاہتا تھا سارا سے کہا تھا کہ تم جہاں کہیں بھی چاہو میں تمہارے لئے گھر بنواؤں یا یہ رقم بینک میں رکھوا دوں مگر سارا نے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا۔

''میرا جسم معمولی تھا سو میں نے اسے کتوں کے حوالے کر دیا۔ مگر سعید سارا کی روح اتنی معمولی نہیں جو وہ اس کی قیمت لگائے۔''

امرتا پریتم نے اس کتاب کا نام صحیح رکھا ہے ''ایک تھی سارا'' سچی بات یہ ہے کہ جب سارا مرگئی تبھی سب نے پوچھا کہ سارا کون تھی۔ جب سارا خود کہتی تھی کہ دیکھیں ''میں ہوں ایک سارا'' میری لکھی تخلیق دیکھیں، میری سوچ دیکھیں مگر کسی نے اسے اہمیت نہ دی اس وقت اگر سارا کو اہمیت مل جاتی اس کی اتنی کتابیں چھپتی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونے لگتیں۔ ادیب اور دانش ور سارا کو ہڈی سمجھ کر چبا چبا کر کھانے کی بجائے اس کا نفسیاتی علاج کروانے میں اس کی مدد کرتے تو سارا 30 سال کی عمر میں موت سے پہلے مر نہ جاتی کیونکہ ابھی اس کے اندر سوچ، تڑپ اور فن ختم نہیں ہوئے تھے۔

زینب نور کی روداد

مسرت لغاری

(یہ خط روزنامہ جنگ میں ارشاد حقانی کے کالم حرف تمنا میں شائع ہوا)

اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان میں خواتین کے ساتھ ہرگز وہ سلوک روا نہیں رکھا جاتا جس کا تقاضا اسلام کی تعلیمات یا تہذیب و شائستگی کی قدریں کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں یہ دعویٰ تو بہت کثرت سے کیا جاتا ہے اور یہ درست بھی ہے کہ اسلام نے عورت کو بڑے احترام کا مقام دیا ہے لیکن ہمارا عمل اس بات کی گواہی نہیں دیتا کہ دوسرے امور کی طرح ہم خواتین کے معاملے میں بھی اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے میں کامیاب ہیں۔ میں اپنے آپ کو ان لوگوں میں شمار کرتا ہوں جو اپنے دل میں خواتین کے لئے انتہائی احترام کے جذبات رکھتے ہیں اور میں اس بات پر بے حد دکھی ہوں کہ پاکستانی عورت کے ساتھ منصفانہ سلوک روا نہیں رکھا جا رہا۔ اپنے کالموں میں اکثر میں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ محترمہ بے نظیر کی حکومت قائم ہونے کے بعد میں نے اس موضوع پر ایک سے زیادہ کالم لکھے ہیں اور خواتین کے حوالے سے محترمہ کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے اور کہا ہے کہ اگر ان کے دور میں بھی پاکستانی عورت کی حالت ہمہ جہتی طور پر بہتر نہ ہوئی تو شاید ایسا کرنا کبھی بھی ممکن نہ ہو۔ لیکن ایک محترم مراسلہ نگار خاتون نے اس بات پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ میں دنیا جہان کے موضوعات پر لکھتا ہوں مگر عورتوں پر ہونے والے مظالم پر میرا قلم حرکت میں نہیں آتا۔ میری رائے میں یہ شکوہ پوری طرح حق بجانب نہیں ہے' یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ مجھے اس موضوع پر اور زیادہ لکھنا چاہئے تھا لیکن یہ کہنا کہ میں عورتوں کے معاملے میں اپنے فرض سے غافل ہوں' کچھ ایسا درست نہیں۔ بلاشبہ پاکستان میں عورتوں کی سماجی اور اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہے اور ان کے خلاف جرائم کا ارتکاب ایک معمول کی حیثیت رکھتا ہے۔ عورتوں کے

بارے میں بطور قوم ہمارا رویہ نہ صرف اسلام کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ تہذیب اور شائستگی کے ادنیٰ ترین تقاضوں سے بھی فروتر ہے اور بطور قوم ہمیں اپنے رویئے کو بہتر بنانے کی فکر اور کوشش کرنی چاہئے۔

محترمہ مسرت لغاری ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ وہ چند کتابوں کی مصنفہ اور سلجھی ہوئی ادیبہ ہیں۔ انہوں نے ایک تند و تیز خط میں خواتین کے ساتھ پاکستان میں ہونے والے سلوک پر احتجاج کیا ہے۔ میں نے اپنی مدافعت میں چند لفظ لکھ دیئے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شکایت اس قابل ہے کہ اسے اہل ملک کے سامنے آنا چاہئے تاکہ خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک ختم کرنے کی ضرورت کا احساس اور شعور اور زیادہ بڑھے اور حکومت سمیت معاشرے کے تمام طبقے اس ضمن میں اپنے فرائض ادا کریں۔ محترمہ مسرت لغاری نے اپنے خط میں میرے بارے میں بہت اچھے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے اور غالباً" اسی وجہ سے انہیں مجھ سے شکوہ بھی زیادہ ہے۔ ان کا خط جو پشاور روڈ راولپنڈی سے موصول ہوا ہے' مناسب قطع و برید کے بعد پیش خدمت ہے۔ لکھتی ہیں:

محترمی و مکرمی حقانی صاحب! تسلیمات

میں آپ کو یہ خط آپ پر اپنا حق جتانے بلکہ آپ سے اپنا حق چھیننے کے لئے لکھ رہی ہوں۔ آپ پر میرا پہلا حق یہ ہے کہ میں آپ کی قوم کی بیٹی ہوں۔ اس کے ساتھ آپ کی محبت کا وہ عالم ہے کہ میں سمجھتی ہوں اگر اسے آپ کی غیر معمولی متوازن کالم نگاری اور حد درجہ مثبت تجاویز میسر نہ آتیں تو سیاست کا رخ ہی بدل گیا ہوتا۔ اس حوالے سے جو کام آپ کا قلم کر رہا ہے وہ بڑے سے بڑا سیاستدان بھی نہیں کر سکتا۔ پوری قوم آپ کی ممنون ہے۔

آپ پر میرا دوسرا حق یہ ہے کہ صرف آپ کا ایک کالم پڑھنے کے لئے مجھے پورا اخبار برداشت کرنا پڑتا ہے جبکہ آپ جانتے ہیں کہ بلڈ پریشر کی گولیاں زندگی بچانے والی ادویات ہی کی طرح ناقابل رسائی ہیں۔ آج کے اخبارات پڑھ کر کسی حساس انسان کا اعصابی کشیدگی سے بچ رہنا ممکن نہیں۔

میرا آپ پر تیسرا حق ایک قلمکار ہونے کے ناطے سے بھی ہے کہ میں پانچ کتابوں کی مصنفہ اور دو ہفت روزوں کی ایڈیٹر رہ چکی ہوں۔ آپ کو میری بات سمجھنے میں یقیناً وقت پیش نہیں آئے گی۔

آپ پر میرا چوتھا اور بظاہر آخری مگر عظیم تر حق اور انسانوں کے درمیان انسانیت کا رشتہ ہے جس سے آپ کو نہ صرف یہ کہ مفر نہیں بلکہ آپ اس سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔

سو حقانی صاحب اتنے زیادہ رشتوں کے حوالے سے میں نے پوچھنا یہ ہے کہ اپنے قلم کی طاقت میں سے آپ نے خواتین کو کیا حصہ دیا ہے؟ ______ میں نہیں مانتی کہ آپ نے نواب پور میں حوا کی بیٹیوں کے سربازار پر تشدد ننگے ناچ کی خبر نہ پڑھی ہو گی ______ آپ کی نظر سے آسیہ ایوب کیس نہ گزرا ہو گا۔ ڈھوک کھبہ کے درندہ صفت باپ کی مکروہ تصویر آپ نے اخبار میں نہ دیکھی ہو گی جس نے اپنی نوخیز بیٹی کو اپنی دلہن بنا ڈالا۔ آپ کا ذہن سندھ کی نوری' کراچی کی وینا حیات' سرگودھا کی بھتیجی چچا' بھائی کے باپ بیٹی اور کراچی ہی کی دو نوخیز طالبات بہنوں کا غنڈوں کے ہاتھوں ریزہ ریزہ ہوجانے کے واقعات کو بھول چکا ہو گا _____ اور _____ اب پنڈی کی زینب نور کے جسم کے اندرونی نازک نظام کو بجلی کے جھٹکوں سے جلا کر راکھ بنا ڈالنے کی لرزہ خیز اور قیامت خیز خبر آپ نے نہیں پڑھی ہو گی _____؟

مجھے بتایئے حقانی صاحب آپ کا قلم ان تمام واقعات پر خون ٹپکانے سے کیوں گریزاں رہا؟ آپ جو اپنے ملک کی گلیوں میں غلط مقام پر گرنے والے تنکوں کی آواز پر بھی چونک جاتے ہیں' معمولی سے معمولی مسئلہ بھی حب الوطنی کے تقاضے کے تحت آپ کی نظر سے نہیں بچ سکتا آپ اتنی بڑی بڑی قیامتوں پر کیسے چپ ہیں؟ اور چپ رہے ہیں؟ بلکہ کسی مرد کالم نگار نے آج تک ایک لفظ بھی اس سلسلے میں نہیں لکھا ______ میں پوچھتی ہوں حقانی صاحب آپ نے خواتین کو زندگی سے بچانے کے لئے اب تک حکومت کو کیا تجاویز پیش کی ہیں؟ مردانہ معاشرے کے مردانہ قوانین

میں کونسی تبدیلیاں کروائی ہیں؟ _______ مجھے ہی نہیں ملک کی کئی بیٹیوں کو آپ کے قلم پر ناز ہے' آپ کی انسانیت دوستی پر فخر ہے' آپ کی صحت مند سوچوں پر مان ہے۔ آپ کو ہمارا یہ فخریہ مان اور یہ ناز روند ڈالنے کا حق کس نے دے دیا؟

میں اسے آپ کا مردانہ تعصب نہ بھی کہوں تو بھی انسانیت و آدمیت کے حوالے سے مجھے آپ سے یہ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے ______ کہ آپ نے درندوں کو عبرتناک سزائیں دلوانے کے لئے قلم کیوں نہیں اٹھا؟ ________ آپ نے قلم کا وہ فرض یا قرض کیوں نہیں چکایا جس فرض کی ادائیگی کی خاطر قوم بھر کی بیٹیوں کا آپ کی طرف منہ تھا؟ ______

میں مانتی ہوں کہ عورتوں کے معمولی سے معمولی درد اور مسائل پر تڑپ اٹھنے والی محترمہ بے نظیر کے برسراقتدار آنے پر ہم خود کو ایک حفظ اور امان کے حصار میں محسوس کرتی ہیں خواتین ایک خاتون کی پناہ میں آ گئی ہیں مگر مرد کالم نگاروں کو کیا ہوا؟ _______ وہ لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے اخبارات میں مردوں کی درندگی کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟ _______ ایک عورت پر ظلم ہوا تو عورتیں اپنی محبوب وزیراعظم سمیت بھاگ کر بے بس زینب نور تک پہنچ گئیں لیکن ایک بھی مرد بجلی کی ننگی تاریں لے کر درندگی کے امام' امام مسجد تک نہیں پہنچا۔ کوئی اس کے جسم کے اندرونی نظام اور نازک حصوں کو جھٹکے لگانے نہیں گیا _____ اسے کوڑے لگانا' اس پر تھوکنا اور اس پر سنگ باری کرنا مردوں کا کام تھا مگر مرد خود کو اپنے ہی ہاتھوں کیسے سنگسار کر ڈالیں؟ انہوں نے ایسی ہی درندگی کی اپنی نجی زندگیوں میں گنجائش رکھنے کی خاطر درندوں کو نظرانداز کرنا سیکھ لیا ہے ________ مرد پر تشدد ننگے ناچوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ان مقدمات کو بھی سرد خانے میں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا ہے جن میں سے اگر کسی ایک بھی مقدمے پر کسی کو عبرت ناک سزا ملی ہوتی تو آج ایسے واقعات کو بار بار نہ دہرایا جاتا _____ آج بھی گاؤں دیہاتوں کی ہر تیسری گلی میں با جماعت ننگی عورتیں گزاری جاتی ہیں اور انہیں جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

حقانی صاحب ابھی تو چار دن ہوئے خواتین کے حقوق کے عالمی دن کے موقع پر بول بول کر ہم خواتین کے حلق سوجھے ہوئے تھے۔ ابھی تو خواتین کو آسمانوں پر پہنچا دینے کے کھوکھلے بیانات کی اخبارات میں سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ عورت کو اس کے حقوق عملی صورت میں مل گئے۔ ہم خواتین اس احسان پر شکر گزار ہیں اور دعا گو ہیں۔

آخر میں کہنا یہ ہے کہ ملک بھر کے مردوں کو سنوا دیں کہ ان کا عملی پیغام لڑکوں کی نوجوان نسل تک بھی پہنچ گیا ہے۔ یہ کھیپ تیار ہو رہی ہے خدا ان کو اپنے ہاتھوں یہ فصل کاٹنے کی توفیق دے (آمین) مردانہ معاشرہ قابل مبارکباد ہے جس نے امام مسجد کو ابھی تک اپنے کالر پر پھول کی طرح سجا رکھا ہے اور اس کی خوراک کا بدرجہ احسن انتظام کر رکھا ہے جبکہ ساری قوم جانتی ہے کہ وہ کوئی سیاسی مجرم یا سمگلر نہیں جس سے مزید جرائم یا مجرموں کا راز اگلوایا جائے یا تفتیش مکمل کرنے پر سالہا سال صرف ہوں گے۔ اس کا جرم تسلیم شدہ ہی نہیں لاکھوں آنکھوں کا دیکھا اور چھوا ہوا ہے اور جس کی دہائیاں اپنے منہ سے لمحہ لمحہ آگ کے شعلے اگلنے والی زینب نور دے رہی ہے کہ خدا کے لئے اسے بھی اسی کی طرح بجلی کے جھٹکے دے دے کر لوتھڑے لوتھڑے کر کے کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے۔ مگر حقانی صاحب یہ کام کرے گا کون؟ ______ کیا یہ کام بھی انہی عورتوں کو کرنا پڑے گا جس نے پوری دنیا کے مردوں کو جنم دیا ہے اور آج انہی مردوں ہی کے قدموں میں خود رل رہی ہیں؟

دعاگو مسرت لغاری

دوسرا حصہ

شاعری

بارہویں ترمیم میں ترمیم

کشور ناہید

چاروں طرف پھیلے ننگے پن کے طاعون سے
نجات پانے کے لئے
میں نے اپنے زمانے کے فرعونوں سے التجا کی
کہ ہمارے پیدا ہوتے ہی
دفن کرنے کی رسم کو
شریعت بل کا حصہ بنا دو

وینا حیات اور آسیہ ایوب کی فرد جرم

کشور ناہید

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
ان ہاتھوں نے
جن کی انگلیاں بندوق کی لبلبی پہ
اور مٹھیاں بیعت زر کے لئے
کھلی رہتی ہیں

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
ان آنکھوں نے
جنہوں نے ماں کے پیٹ سے نکل کر
کھلنا سیکھا تھا
اور جنہوں نے حرف دعا لینا اور اپنا دودھ بخشوانا بند کر کے
بے غیرتی کے سرمے سے آنکھیں لال کر لی ہیں

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
ان چہروں نے
جن کو ماؤں نے غیرت کا شہد چٹا کے جنا تھا
مگر ان کے ہاتھوں میں عصائے عیسیٰ کے بجائے
دیمک زدہ شہوتوں کی وہ زنبیل تھی
جس میں رشتوں اور جذبوں کی ساری تحریروں کو
قلم زد کر دیا گیا تھا

مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا
ان چہروں نے
جن کے لعین خون کو دیکھ کر
خنذیر بھی نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں
جن کے شیطان ارادوں سے
طوفان پناہ مانگتے ہیں
جن کے ثبوت جرم کی گواہی دینے کے لئے
سپیدی سحر کی جلوتوں سے لے کر
طلوع شب کی سیاہیوں کا ذرہ ذرہ
صف آرا ہے
اور تم!
ضعیفی احساس کے مردہ خوارو
لوح بدن کو مسخ کرنے والو
تم مجھ سے ہی پوچھتے ہو
مجھے اپنے گھر میں برہنہ کس نے کیا ہے

ہم گنہگار عورتیں

کشور ناہید

یہ ہم گنہگار عورتیں
ہیں
جو اہل جبہ کی تمکنت سے
نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں
یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابت امتیاز ٹھہریں
وہ داور اہل ساز ٹھہریں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہرا ہیں اٹی ملے ہیں
ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملی ہیں
جو بول سکتی تھیں، وہ زبانیں کٹی ملے ہیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے

تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا!

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں، نہ ہاتھ جوڑیں!

موم محل

کشور ناہید

میرے بیاہ سے پہلے میری ماں
خواب میں ڈر جایا کرتی تھی
اس کی خوفناک چیخوں سے میری آنکھ کھل جاتی تھی
میں اسے جگاتی، ماجرا پوچھتی
اور وہ خالی آنکھوں گھورتی رہتی
اسے خواب یاد نہیں رہتے تھے
ایک رات خواب میں ڈر کر
اس نے چیخ نہیں ماری
خوف زدہ ہو کر مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا
میں نے ماجرا پوچھا
تو اس نے آنکھیں کھول کر شکرانہ ادا کرتے ہوئے کہا،
"میں نے خواب میں دیکھا تھا
تم ڈوب رہی ہو اور میں نے تمہیں بچانے کو دریا میں چھلانگ لگائی ہے"
اور اس رات بجلی گرنے سے
ہماری بھینس اور میرا منگیتر جل گئے تھے
ایک رات ماں سو رہی تھی اور میں جاگ رہی تھی،
ماں بار بار مٹھی بند کرتی اور کھولتی
اور یوں لگتا کہ جیسے کچھ پکڑنے کی کوشش میں تھک کر
مگر پھر ہمت باندھنے کو مٹھی بند کرتی ہے
میں نے ماں کو جگایا
مگر ماں نے مجھے خواب بتانے سے انکار کر دیا

اس دن سے میری نیند اڑ گئی
میں دوسرے صحن میں آ گئی
اب میں اور میری ماں دونوں خواب میں چیخیں مارتے ہیں
اور جب کوئی پوچھے
تو کہہ دیتے ہیں
ہمیں خواب یاد نہیں رہتے

آس رکھنا

فرحت پروین

رات کی صبح کی شام کی آس رکھنا
انتظار کرنا اور کرتے ہی رہنا
خاموش رہنا اور منہ سے کچھ نہ کہنا
محبت میں بھی روایت عادت کی طرح
دل میں گھلتی جا رہی ہے
روح کو کچلتی جا رہی ہے
اور دل میں بیٹھے ہوئے نام کی
سانول کی دانستہ بے خبری کو
اپنے ہی معنی و منطق پہنا رہی ہوں
اس طرح جیسے discovery اڑان کے لئے تیار
اپنے آقا کی Command کی منتظر
وقت کو زہر مار کرتی جا رہی ہو
اور وہ آقا جو آج کا انسان برابر کا انسان روایتوں کا باغی
تمہارے حسن کو، روایتی حسن کو
ستی کی حیا، بدھا کے مجسمے کو
شام و سحر قوس و قزح کو
اپنے رنگوں میں ڈھالنے کے لئے
تم سے تمہاری پاکیزگی کے اعتبار کا خراج
انتظار کی امتحان گاہ کی صورت وصول کر رہا ہے
روایت کو نبھا رہا ہے
کیا بے خبر ہے کہ محبت احساس کے بغیر

عزت کے احساس کے بغیر
گناہ کا، تماش بینی اور طوائف کا
گدھ و مردار کا رشتہ ہے
جس نے دنیا کو ناجائز ہوا، احساس اور انسانوں کے
اسلحے سے بھر دیا ہے
وہ اسلحہ جو کبھی بھوکی نظروں، طنز کے تلخ نشتروں
قید تنہائی کے عذاب، بے اعتبار محبت اور بھروسے سے خالی
پیار کی صورت، ہمیں چھلنی کر رہا ہے
مگر کیا کبھی رات کے کسی پہر
یا ڈھلتی دوپہر کا جام پیتے ہوئے
تمہیں اپنے دعوئ محبت کا ادراک ہوا ہے
کہ وقت کی چھلنی، بے رحم چھلنی
احساس کو اک بار راہ دے دے تو واپس نہیں لیتی
ماں اک بار دنیا میں جنم دے کر
بچے کے لئے کوکھ وا نہیں کرتی
پاک دودھ وقت کے اثر سے زہر ہو جاتا ہے
جسے پینے والے بچے
اس دنیا کے باسی ہیں
جو ہمیں دکھ دے رہی ہے

بوڑھی ماں

گل نار

آج تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟
تمہارے چہرے کی جھریوں میں ستر سال کی المناک
کہانی اتنی واضح کیوں ہے
تمہاری پر نور آنکھیں ساکت ہیں
خمیدہ کمر تمہیں مزید سوگوار بنا رہی ہے
تم کیوں اداس ہو؟
تم نے تو بیٹے جنے تھے
کیا تمہیں اپنی پیدائش یاد آ رہی ہے
جب تمہاری آمد نے
تمہاری ماں کی آنکھیں پر نم کر دی تھیں
تمہارے باپ کا سر جھک گیا تھا
یا لڑکپن کا وہ دور یاد آ رہا ہے
جب تمہاری شرارتوں اور کھیلوں پر
یہ کہہ کر پابندی لگا دی گئی تھی کہ
لڑکیاں ایسے کھیل نہیں کھیلتیں
یا پھر
تم اپنے سے آٹھ سال چھوٹے بھائی کی جھڑکیوں کو یاد کر کے
رو رہی ہو
جس کی جھڑکیوں کی پھانس آج بھی تمہارے دل میں ترازو
یا پھر
تمہیں جوانی کے اس موڑ نے دل گرفتہ کر دیا ہے

جب باپ کی غلامی' بھائی کی غلامی' شوہر و بیٹے کی
غلامی میں تبدیل ہو گئی تھی
وہی شوہر جو خدائے مجازی تھا
جسے تم ہر رات سجدہ کرتی تھیں
کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جس کی خواہشوں پر تم خود کو
پیش کر دیتی تھیں
وہی مجازی خدا جس کے پیار اور ظلم کے کتنے ہی نشان
تمہارے خستہ تن پر آج بھی نقش ہیں
ہائے ماں تمہارے مقدر
بچپن باپ کی غلامی' لڑکپن بھائی کی غلامی
جوانی شوہر کی غلامی اور
بڑھاپا بیٹوں کی غلامی میں بسر ہوا
مگر تمہارے تو قدموں تلے جنت ہے
پھر پوہ ماگھ کی ظالم سردی میں
تمہارے پاؤں برہنہ کیوں ہیں
تم تو گھر کی ملکہ ہو
پھر تمہارا ٹھکانہ یہ کوڑے کا ڈھیر کیوں ہے؟
تم نے تو سات بیٹوں کو
اپنے پستانوں کی گرمی سے گھبرو بنایا ہے
پھر تمہارے وجود میں پیاس کیوں ہے؟
تمہارا وجود بھوک کا Symbol کیوں بن گیا ہے؟
بوڑھی ماں میری طرف ان نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہو
میں نے وہ بت توڑ دیئے ہیں
کہنہ غلامی کی ان روایات سے میں نے

خود کو آزاد کر لیا ہے
میں اس خوش فہمی سے نکل آئی ہوں
کہ میرے قدموں تلے جنت ہے
میں نے اپنے پیروں میں چمڑے کے مضبوط جوتے پہن لئے ہیں
میں نے اپنے ہاتھ سے جھاڑو چھوڑ دیئے ہیں
میں نے اپنے ہاتھ میں کتاب و قلم کو تھام لیا ہے
میں نے اپنے سر سے باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کی دی ہوئی
غلامی کی چادر کو نوچ گرایا ہے
اور اپنے سر پر اپنی ذات کی ردا اوڑھ لی ہے
میں نے اپنی آنکھوں سے شرم کی پٹی اتار پھینکی ہے
اور شیشے کی عینک آنکھوں پر چڑھا لی ہے
تاکہ میں دنیا کو اپنی نظر سے دیکھ سکوں
ہاں اب مجھ کو اطمینان ہے
کہ ستر سال کی عمر میں سات بیٹوں کو جن کر
کوڑے کے ڈھیر پر نہیں بیٹھوں گی
اور کوئی میری ہم جنس مجھ سے
یہ سوال نہیں کرے گی کہ
"بوڑھی ماں تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟"

آزادی چھیننے والو

نسیم بانو

یہ کیسی آزادی ہے جس نے، مجھ سے قوت گویائی چھین لی ہے
میری سوچ پر پہرہ لگایا
میرے پاؤں میں زنجیریں طاقت کی پہنا دیں
جب زنجیروں سے زخم پاؤں کے گہرے ہو گئے
اور سوچوں پر میری پہرے ہو گئے
زنجیروں کا ان پہروں کا جب مجھ پر بوجھ بڑھتا گیا
میرے اندر سے اک آواز آئی
شاید میری روح یہ بوجھ سہہ نہ پائی
وہ آواز ایک ایسی آواز
جس میں شامل نئی زندگی کا ساز
نئی زندگی کا اک ساز
سن کر جس کی آواز
میں نے ان زنجیروں سے، سوچ پر لگے پہروں سے
اپنی روح کے بوجھ کو آزاد کر لیا، طاقت کی زنجیروں کو توڑ دیا
میرے اردگرد بہت شور ہوا، ارے یہ کیا کیا یہ کیا کیا؟
میرے اندر اک سکون اترا، کہ میری روح کا بوجھ ختم ہو گیا
اب میں اپنا ناطہ نئی زندگی کے ساز سے جوڑنا چاہتی ہوں
رخ زندگی کا اپنی مرضی سے جوڑنا چاہتی ہوں
ظالموں تم کیوں جانو کہ میں کیا چاہتی ہوں
میں تو صرف اپنی آزادی چاہتی ہوں
آزادی بولنے کی، آزادی سوچنے کی

آزادی فیصلے کی، آزادی رائے کی
اظہار کی آزادی، پیار کی آزادی
آزادی تمہارے ظلم کے احتجاج کی
آزادی میری زنجیروں میں قید روح کے علاج کی

بپتا ایک عورت کی

شہناز مزمل

کیا تجھے یاد ہے اک بار کہا تھا تو نے
دھند ہی دھند ہے دم گھٹنے لگا ہے میرا
راہبر کوئی نہیں ہے جو دکھا دے منزل
کیا مرے ساتھ سفر تجھ کو گوارا ہو گا
سایہ بن کے تو سدا ساتھ رہے گی میرے
غم و آلام بھی تو ساتھ سہے گی میرے
مانگ تیری میں ستاروں سے سجا رکھوں گا
دل سنگھاسن کی تجھے رانی بنا رکھوں گا
تیری چنری میں دھنک رنگ سبھی بھر دوں گا
میرا جو کچھ بھی ہے وہ نام تیرے کر دوں گا
کتنی نادان تھی قیدی میں ہوئی لفظوں کی
ہمسفر بن کے تیرے ساتھ میں چلتی بھی رہی
وقت تو ٹھہرا نہیں عمر مری ڈھلتی رہی
آگ جو تیری محبت نے لگائی جاناں
میں تو چپ چاپ اسی آگ میں جلتی بھی رہی
اوڑھ لی میں نے ساخت تو تھکن بڑھتی رہی
روز گر گر کے سنبھلتی رہی چلتی بھی رہی
کیا تجھے یاد ہے کچھ وقت گزر جانے پر
مجھ سے اک بار مری جان کہا تھا تو نے
ساتھ رہنے کے لئے خوشیاں ضروری تو نہیں
ساتھ چلنا ہے تو گرداب میں جینا ہو گا

ضبط گریہ سے تجھے ہونٹوں کو سینا ہو گا
کاٹ کر کشت لبوں پر نہ شکایت ہو گی
بن کے سقراط تجھے زہر بھی پینا ہو گا
تو جو عورت ہے تیرے ذمے ہے دکھ ہی سہنا
بے زباں رہنا زبان سے نہ کبھی کچھ کہنا
پا بریدہ تجھے گر گر کے سنبھلنا ہو گا
اپنے ہر خواب کو آنکھوں میں کچلنا ہو گا
تو کسی بات پہ اصرار نہ کر پائے گی
تو کسی بات سے انکار نہ کر پائے گی
مجھ سے مجرم کو سزاوار بھی سمجھے لیکن
پر کسی طور نگوں سار نہ کر پائے گی
اپنا ہر بوجھ تجھے خود ہی اٹھانا ہو گا
اپنا ہر راستہ خود تجھ کو بنانا ہو گا
تلخ احساس سے دم تیرا اگر گھٹنے لگے
اپنی دنیا کے خدا سے بھی چھپانا ہو گا
دکھ کسی طور کسی کو نہ بتانا ہو گا
چشم گریہ کبھی کھل کر نہ کر پائے گی
اور ہر تیر ستم سینے پہ کھانا ہو گا
واسطہ تیرا رہے گا سدا حیوانوں سے
بھیڑیے کتنے ہی غراتے ہوئے آئیں گے
یہ ہے دنیا یہاں ابلیس رہا کرتے ہیں
اپنے دامن کو سدا ان سے بچانا ہو گا
کئی شیطانوں کو انسان بنانا ہو گا
تیری ہر بات پہ خم میں نے کیا اپنا سر

اپنے ہاتھوں پہ ہی روکے کئی چلتے خنجر
شعلوں سے تجھ کو بچانے کے لئے جان عزیز
چشم پرنم میں ڈبوئی تھیں ردائیں اپنی
جو دھنک رنگ مری چنری باندھے تو نے
ان کو نمناک کئے رکھا ہمیشہ میں نے
آگ بھڑکی جو کبھی ان سے بجھائی میں نے
میں دھنک رنگ بنی ساتھ تیرے چلتی رہی
روح کے قریہ ویران کو چھپائے رکھا
بڑھتے طوفان میں اک لو کو جلائے رکھا
آخرش ایسا بھی اک بار ہوا تھا جاناں
سانس رکنے لگی اور حوصلہ مجھ میں نہ رہا
گھٹ گئی سانس تو بے ساختہ نکلی تھی کراہ
اور چکرا کے توازن نہ رہا تھا قائم
تو نے اس دن جو کہا تھا وہ تجھے یاد ہے کیا؟
کیوں مکر کرتی ہے اے عورت بد ذات بتا
سب ہیں چالاکیاں کچھ بھی تو نہیں تجھ کو ہوا
تو سمجھتی ہے پسند آئے گی تیری یہ ادا
تیری اس چال پہ ملتی ہے ابھی تجھ کو سزا
ہے مرے پاس یہ حق آج ہی دے دوں گا طلاق
تو تو عورت ہے تجھے اور بھگتنا ہے عذاب
حسن باقی نہ ترا ہے نہ جوانی تجھ میں
مجھ میں دم خم ہے ابھی اور جوانی مجھ میں
لڑکھڑاتی ہوئی دم سادھ کے اٹھ کر چل دی
کیا رہا باقی تھا جو بات میں تجھ سے کرتی

کاش پڑھ سکتا کبھی تو بھی میرے چہرے کو
کاش آ کر شب ہجراں میں خبر بھی لیتا
کاش وہ شام غریباں جو مجھے ڈستی تھی
تیرا سویا ہوا احساس جگا بھی سکتی
خوب تھا یاد مجھے بھی کہا تھا تو نے
خوب تھا یاد مجھے جو بھی سہا تھا میں نے
کیا کبھی تجھ سے بھی اظہار کیا تھا میں نے
جان نثاری کا ہی کردار کیا تھا میں نے
کیا تجھے یاد ہے کیا تجھ سے کہا تھا میں نے

موم کے سائبان

شہناز مزمل

سکوت شام میں بجتی ہوئی گھنٹی کی آوازیں
افق میں ڈوبتے سورج کی سرخی
فضا میں تیرتے بادل کے ٹکڑے
اور بدلتی رت کی خوشبو
وہی منظر
کسی سپنے کی صورت آنکھ کی پتلی میں رہنے دو
ہجوم بیکراں ہے
کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا
کسی برگد کا دکھ
اور ڈار سے بچھڑی ہوئی ایک کونج کی لمبی اڑانوں کو
کہ سب کے سب تو خود کھوئے ہوئے ہیں
اور اپنی ان چمکتی تیز آنکھوں کو مچانوں پر سجایا ہے
تو یوں تاریکیاں اندر ہی اندر بڑھتی جاتی ہیں
سلاسل یاس کے پھیلے ہوئے ہیں
سمندر دور، دریا دور، بادل دور ہیں جاناں
کڑی ہے دھوپ منزل بے نشاں ہے
کسی دیوار کا سایہ
کوئی باران رحمت کی ردا سر پر نہیں ہے
کہ جتنے سائباں ہیں سب کے سب ہیں موم کے جاناں
ہجوم بیکراں ہے

اور اب ان سائبانوں میں
جو جلتی آگ سے قطروں کی صورت بہہ رہے ہیں
پنہ کس کو ملے گی
کون ٹھہرے گا یہاں
ہجوم دہر کو کیا ہو گیا ہے
کہ ہر اک آرزو کو جستجو کو ختم کر کے
اپنی آنکھوں کو مچانوں پر سجایا ہے

غزل

در انجم عارف

یہ کیسی روشنی ہے تیرگی چھٹنے سے پہلے
کوئی روشن ہوا ہے خاک میں ملنے سے پہلے
میں اپنی ذات کی دہلیز پر حیراں کھڑی ہوں
دیارِ دوست میں پہلا قدم رکھنے سے پہلے
لہو کے داغ سارے آستیں سے دھل گئے ہیں
بس اتنا دیکھ لینا تم گلے ملنے سے پہلے
کوئی جگنو کوئی تارا کہیں سے مانگ لینا
مزارِ دشتِ وحشت کا دیا بجھنے سے پہلے
جو ممکن ہو تو اپنے حوصلوں کو اوڑھ لینا
سکوتِ دشت میں ٹھنڈی ہوا چلنے سے پہلے
جہاں اب دھوپ کے نیزے اترتے ہیں بدن
وہاں اک سائباں تھا آندھیاں چلنے سے پہلے
خود اپنے آشیاں کو شاخِ گل سے نوچ لینا
گلستاں کی فضا میں بجلیاں گرنے سے پہلے
وہ جن سے رشتۂ جاں کی قسم کھانے چلے تھے
انہیں پرکھا تو ہوتا واسطہ پڑنے سے پہلے
کہ اب تو منزلوں تک ہی سفر کا سلسلہ ہے
تم اتنا سوچ لینا راہ میں رکنے سے پہلے
بڑی مشکل سے ہم نے نیند کو روکا ہے انجمؔ
کہیں ہم سو نہ جائیں داستاں کہنے سے پہلے

واپسی

(روزگار کی خاطر سمندر پار جانے والے پاکستانی نوجوانوں کی نذر)

در انجم عارف

یہ اک کہانی نہیں حقیقت میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہے
کہ ایک دولہا جب اپنی دلہن بیاہ کے لایا
تو وقت نے اس کی غربتوں سے بھی زندگی کا خراج مانگا
وہ اپنے دامن میں چند گزرے حسین لمحوں کی دھول لے کر
اور اپنی آنکھوں میں کھلتے خوابوں کے پھول لے کر
وہ دور پردیس کو سدھارا
وہ جب گیا تھا تو اس کی دلہن کے نرم لہجہ میں تازگی تھی
اور اس کی باتوں میں دل کشی تھی
اور اس کی آنکھوں میں روشنی تھی
سیاہ بالوں میں رات پھیلی تھی اور چہرے پہ چاندنی تھی
پہ وقت کی قید با مشقت گزار کر جب وہ گھر کو لوٹا
تو اس نے دیکھا کہ اس کی کایا پلٹ چکی تھی
اب اس کے چہرے پہ رات پھیلی تھی اور بالوں میں چاندنی تھی

میں دکھیاری مورکھ ناری

درانجم عارف

جب میں چھوٹی تھی تو ماں کہتی تھی
تو مورکھ ہے، باہر مت جا، بابا ڈانٹے گا
جب جانا تو پوچھ کے جانا، یا پھر بھیا کو لے جانا
میں نے سوچا، ایسا کیوں ہے
بھیا تو باہر جاتا ہے
کھیلتا ہے پھر آجاتا ہے
میں بھی واپس آجاؤں گی
بابا کیوں مجھ کو ڈانٹے گا
میں نے کیا نقصان کیا ہے
اور میں پہروں سوچا کرتی، ایسا کیوں ہے، ایسا کیوں ہے
یونہی سال گزرتے جاتے
پھر اک دن ایسا آیا تھا
آنگن میں اک میلہ سا تھا، سب آئے تھے
رنگ برنگے آنچل گھر میں لہرائے تھے
اماں خوش تھی بابا خوش تھا، میں بھی خوش تھی
رنگ برنگے کپڑے، گہنے، پانے پہنے میں بھی خوش تھی
پھر جانے کیا بات ہوئی تھی
اماں بابا سب روئے تھے
آنسو کا اک ریلہ سا میری آنکھوں میں بھی اترا تھا
پھر اماں بابا نے مجھ کو غیروں کو سونپا تھا

اور کہا تھا ـــــ جاؤ اب اپنے گھر جاؤ
میں دکھیاری کچھ نہ سمجھی
چپکے سے ڈولی میں بیٹھی، جانے کونسے دیس سدھاری
اور جب ڈولی سے اتری تھی تب دیکھا تھا
چھوٹا سا اک گھر، اپنے جیسا
میں سمجھی یہ میرا گھر ہے، بابا نے تو یہی کہا تھا
لیکن وہ کب میرا گھر تھا
یہ تو بس آنگن بدلا تھا
یہ تو شاید اس کا گھر تھا
وہ جو مجھ کو اپنے گھر میں لے آیا تھا
میں تو اس کو سکھ پہنچانے
اور اس کے اس گھر کو سجانے کو آئی تھی
میں دکھیاری مورکھ ناری
بابا کا گھر چھوڑ کے اب اس کا گھر کرنے کو آئی تھی
میں دکھیاری مورکھ ناری

کڑیاں چڑیاں

ثروت محی الدین

کڑیاں چڑیاں
کھیڈن کھیڈاں
کلی گدے پاون

ناچ نہ بدلن
گیت نہ بدلن
مطلب بدلدے جاون

اج دا سورج چڑھیا

ثروت محی الدین

چار چوفیرے
چانن دے وچ
ایس چانن دے وچوں
جو کجھ لبھ سکدا اے
لینا اے
کچیاں شیواں نوں پکن لئی
اج دی جھولی پانا اے
جنے سورج چڑھ کے ڈھل گئے
اونہاں سبھ دی گرمی
اج دی دھپ دی گرمی وچ
کچیاں شیواں دے پکن لئی
آپنا سیک رلائے گی
آون والے کل وچ
اج دی ساری گرمی
ساری سوچ
آپنا رنگ بھرے گی
سورج دے ڈبن توں پہلاں
اج دے سچ نوں
گوہڑے رنگ وچ
رنگنا اے

دوروں نیڑیوں

ثروت محی الدین

دیکھن والیاں نے جو ڈٹھا
اوہ وی سچ سی!
عمر دوپہرے
تپدی دھپ وچ
ہرے بھرے اس دکھ دے تھلے
گوہڑی چھانویں
انج کھلوتی
جیویں چین آرام دی اوہ
تصویر سی کوئی
پر جنہوں
اوہ دیکھ رہے سن
اوہدے پیریں سول پروتے
خبرے کنے پینڈے کٹے
کنج اوہ اپڑی اتھے تائیں
بھکھی تے ترہائی ہوئی
سوچ رہی سی
کنجے چلے
دکھ دے تھلے
کلم کلی

چپ کھلوتی
دیکھ رہی سی
چار چوفیرے
لو دے گھیرے

عورت

ثروت محی الدین

دریا کے کنارے پر
رسی سے بندھی ناؤ
کھاتی ہوئی ہچکولے
پانی میں پڑی ناؤ
رہ رہ کے مچلتی ہے
بہتے ہوئے پانی میں
چلنے کو ترستی ہے

کیوں باندھ کے رکھتے ہو
پانی میں اترنے دو
جس سمت بہاؤ ہو
اس سمت میں چلنے دو

موجوں میں ہے دم کتنا
دریا میں ہے خم کتنا
رفتار بہاؤ کی
یہ اس کو پرکھنے دو

کتنا ہو سفر اس کا
پہنچے وہاں کہاں کب تک

یہ ناؤ کی ہمت ہے
تم اس کو نہ یوں روکو
بس دوش پہ لہروں کے
دریا سے گزرنے دو!

غزل

شاہدہ حسن

منافقوں سے میں کب تک مکالمہ کرتی
زباں کو رہن نہ رکھتی اگر تو کیا کرتی

ملا تھا اذن تکلم مگر یہ شرط بھی تھی
ہر اک سخن میں بہ انداز التجا کرتی

تمام شہر میں زندہ سماعتوں کا ہے قحط
کسے پکارتی اور کس کو ہم نوا کرتی

بجھا کے دل، ترے دست طلب پہ رکھ آئی
ذرا سی چیز پہ کیا دل ترا برا کرتی

بس ایک بار اگر جھک کے مجھ سے مل لیتا
تو عمر بھر جو وہ دل مجھ سے چاہتا، کرتی

درست ہے جو اسے مجھ سے یہ شکایت ہے
میں اپنے حق میں کبھی کوئی فیصلہ کرتی

آج کے دن کے نام

شاہدہ حسن

گراں گوشو!
سفر کے آخری لمحوں کی لذت
تم سے کہہ کر
کیوں سبک سر ہوں
کہ تم تک کب میری آواز پہنچی ہے؟
جو پہنچے گی؟
اگر زحمت کرو!
تو کھول کر آنکھیں مجھے دیکھو!
یہ میرے خال و خد، میری "گواہی" ہیں
اگرچہ آندھیوں کی زد میں
ان کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں
مگر ایسا تو ہونا تھا
سفر میں دھوپ بھی ملنی تھی، بارش بھی
کبھی ـــــ طوفاں کے بے پایاں تھپیڑے بھی
بکھرتے جسم کو بے آسرا ناؤ سمجھ کر، ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے جو
طوالت ـــــ ایک ایسی رات کی درپیش تھی مجھ کو
جو کٹتے کٹتے اپنی آخری حد تک پہنچتی تھی
تو پھر تاریک سے تاریک تر ہو کر، اچانک لوٹ پڑتی تھی
کہ جیسے اس کی میری ہمراہی ہی
زندگی کی "شرط اول" ہو
اور اک ایسی ہی گہری شب میں

تم اک آئینہ دے کر مرے ہاتھوں میں
کہتے تھے
کہ یہ چہرہ، یہ زلفیں
اور یہ لب
اور ان کی سحر کاری
زندگی کے استعارے ہیں
یہ ہر پل رقص کرتی روشنی کے دائرے ہیں
حسن کی انمول دولت ہیں
جو میرا "حاصل کل" ہیں
مری پہچان ہیں
میرا تعارف ہیں
یہ تن سیراب کر دینے کا فن، میرا ہنر ہے
اور میری ذات ____ میرے جسم و جاں کی ساری سرشاری کا محور ہے
"کنیزی" کا یہی ملبوس شاہانہ مرے قامت پہ سجتا ہے

رفاقت اور محبت
اور تقدس کے حوالوں سے
مجھے تم زندگی کی رہ گزر میں جب کبھی ہمراہ رکھتے تھے
میں "کشکول گدائی" لے کے چلتی تھی!
وہ سارے خوش نما ناموں کے بہلاوے
جنہیں تم میرے دل کی سادگی سے کھیلنے کی داد دیتے ہو
پہیلی تھے
جنہیں میں عمر بھر اپنی ذہانت کی کسوٹی پر لئے پھرتی رہی
پر آج تک بوجھی نہیں ہوں

میں اپنے طاق جاں میں سچے جذبے رکھ کے اکثر
بھول جاتی تھی
اور ان کے لمس سے بھی ڈرنے لگتی تھی
کہ گر اک پل' لہو کی گردشوں سے ان کے قدموں کی کوئی آہٹ ابھر آئی
تو ہر رشتہ ____ تمہارے اور میرے درمیاں
مشکوک ٹھہرے گا
میں اپنے دل پہ لکھے حرف کو پڑھتی تھی
پر کچھ ایسے پڑھتی تھی
کہ جیسے وہ کوئی فہرست ہوں میرے جرائم کی
یہ نا آسودگی کے زخم سارے ____ زخم کب تھے؟
میرے زیور تھے
جنہیں میں روح کے آراستہ رکھنے کو' خود مہکائے رکھتی تھی

مگر ____ اب جسم و جاں کو خاک کرنے کی
وہ رت بیتی
یہ گویائی کا موسم چار سو جادو جگاتا ہے
مری "لب بستگی" ____ اظہار کی شوخی سمیٹے مسکراتی ہے
نئے لہجے' نئے طرز تخاطب سے
تمہیں آواز دیتی ہے
سناتی ہے
کہ میرے لمس کی لذت میں
سرشاری کی ساعت ڈھونڈنے والو
مری زلفوں' مری پوشاک کی خوشبو میں

رستہ بھولنے والو
رفاقت اور محبت کوئی سولی تو نہیں ہے
جس پہ تم لٹکا کے مجھ کو بھول جاتے ہو
"رفاقت اور محبت" تو
سفر ہے ____
"عمر بھر کا"
جس کے طے کرنے کی پہلی شرط ہی
"میں" ہوں

میں کہاں ہوں

عذرا عباس

میں لائنیں کھینچتی ہوں
پہلے دائیں سے بائیں
ایک دو تین
بہت سی
پتہ نہیں کتنی
پھر انہیں اوپر سے نیچے کاٹتی جاتی ہوں
ایک جال سا بنا دیتی ہوں
جیسے دور سے نظر آ رہا ہو
ان سلاخوں کی طرح
جن کے پیچھے
کسی کو قید کر دیا گیا ہو
یا ڈال دیا جائے
سمندر میں
اور پھنسایا جائے بہت سی مچھلیوں کو
روز یہی کرتی ہوں
لکھنے بیٹھتی ہوں اک نظم
یہ سوچ کر کہ ابھی لکھ دوں گی
ایک نظم
یہ دیکھنے کے لئے کہ
کیا میں صرف ایک Idiot House Wife رہ گئی ہوں
یا ایک تھکی ہوئی Working Woman
لیکن میں تو

ہر وقت سوچتی رہتی ہوں
ہر وقت
کھانا پکاتے ہوئے
بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے
Official Meetings کے دوران
وہاں بھی جہاں مجھے صرف سوچنا نہیں چاہیے
بالکل اس سمے
جب مرے شوہر کی تمام قوتیں
مرے جسم کے اندر صرف ہو رہی ہوتی ہیں
میں سوچتی ہوں
بہت سے بکھیڑے مردانہ وار نبٹاتے ہوئے بھی
اس وقت بھی
جب تمہارے ہاتھ میرے گریبان کے بٹن کھول رہے ہوتے ہیں
اور جھانک رہی ہوتی ہیں
تمہاری آنکھیں
میرے شفاف سینے کی جلد کے ننھے ننھے دائروں کو
لیکن ہر وقت سوچتے ہوئے بھی
جب میں نظم لکھنے بیٹھتی ہوں
تو صرف
لائنیں کھینچنے لگتی ہوں
سیدھی سیدھی سیدھی
اور انہیں کاٹ کاٹ کر
جال بنا دیتی ہوں
پھر اوڑھ کر بیٹھ جاتی ہوں خود یہ جال
سہمی ہوئی چڑیا کی طرح

بیزاری آتی ہے

عذرا عباس

میں سارے کام چھوڑ دیتی ہوں
کھانا، پینا، حتیٰ کہ نہانا بھی
میل لدے پہ لدے میرے جسم پر چڑھنے لگتا ہے
دل چاہتا ہے
کسی درخت کی اونچی شاخ پر بیٹھ کر
لوگوں کو گزرتے ہوئے دیکھوں
اور جب وہ نیچے سے گزریں
ان کے سروں پر تھوکتی جاؤں
بیزاری یوں آتی ہے
جیسے بہت مضبوط ہاتھوں سے
کوئی مجھے نچوڑ رہا ہو
گول گول
پھر میں کھلنے لگتی ہوں
اور کھلتی چلی جاتی ہوں
آنگن میں پھیلنے والے کپڑوں کی طرح
بیزاری
مرے گھٹنوں اور انگلیوں کی پوروں میں گھس کر
مجھے چھیڑتی ہے
مرا دل چاہتا ہے
چاروں ہاتھ پاؤں سے چلوں
اور بھونکنے لگوں

اور چلتے ہوئے راہ گیروں کو کاٹ کھاؤں

یہ بیزاری
چھین لیتی ہے مری ہنسی
جو میں اپنی جیسی عورتوں میں بیٹھ کر ہنستی ہوں
اور وہ رونا جو مری جیسی عورتیں روتی ہیں
بیزاری مجھ سے چھین لیتی ہے
کولہے مٹکا مٹکا کر چلنا
جو میں دوسروں کو دیکھ کر چلنا چاہتی ہوں
بس یہ چاہتی ہے
میں کسی درخت کی اونچی شاخ پر بیٹھ کر
آنے جانے والوں کے سروں پر تھوکتی رہوں
اور کسی کو نظر نہ آؤں

یہ کام جو میں کر رہی ہوں

عذرا عباس

یہ کام جو میں کر رہی ہوں
اس سے پہلے بھی
میں ایک کام کر رہی تھی
اور اس سے پہلے بھی
یہ کام کرتے ہوئے میں سوچتی ہوں
میں اس سے پہلے کیا کر رہی تھی؟
دھیان آتے ہوئے
دل میں
سرشاری کی ایک ہلکی سی لہر اٹھتی ہے
شاید وہ کام دلچسپ تھا
کام یاد نہیں آیا
اور اس سے پہلے
وہ بھی بھول گئی
نہیں، یاد آیا
ٹوٹی مسہری کو جوڑتے ہوئے
ایک پھانس چبھی تھی
اسے یاد کرتے ہوئے تو
یہ بھی بھول گئی
میں ابھی کیا کر رہی تھی
یہی ہوتا ہے
ہمیشہ یہی ہوتا ہے

جب بھی ایسے ہی ہوا تھا
جب میں نے کسی کو پہلی بار دیکھا تھا
اور بھول گئی تھی
پھر جب مجھے دیکھا گیا
تو یاد آیا
کہ اس سے پہلے یہ ہوا تھا
اب میں ہتھیلی کی پھانس نکال رہی ہوں
اور یاد کر رہی ہوں
ابھی میں کیا کر رہی تھی؟

پیار کی سرحدیں

عطیہ داؤد
ترجمہ : فہمیدہ ریاض

پیار تو مجھ سے بے شک کرتے ہو
روٹی کپڑا اور مکان دینے کا وعدہ کیا ہے
اس کے بدلے میرا جیون گروی رکھ لیا ہے
گھر کی بہشت میں مجھے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے
بس اسی طرف جانے کی ممانعت ہے
جہاں شعور کے درخت میں سوچ کا پھل لگتا ہے
اور ابھرتا سورج مجھے قدم بڑھانے پر اکساتا ہے
آج یہ پھل کھا لیا ہے تو تم آپے سے باہر ہو گئے ہو
سوچ نے کھول ڈالی ہیں ساری کھڑکیاں ذھن کی
تمہاری بہشت میں میرا دم گھٹنے لگا ہے
میں فیصلے کرنے کی آزادی چاہتی ہوں
سوچ کے میوے نے اتنی طاقت دے دی
روٹی کپڑا اور مکان آسمان کے تارے تو نہیں
جن کو صرف تم تو توڑ سکتے ہو میں ہی نہیں توڑ سکتی
رسم رواج قانون و مذہب
پہاڑ بنا کر مت کھڑے کرو
سوچ کی انگلی تھام کر میں انہیں پار کر جاؤں گی
پیار تو مجھ سے بے شک کرتے ہو
مگر پیار کو نکیل بنا کر تو میرے ناک میں مت پہناؤ

ہاں شعور کے درخت سے سوچ کا پھل تم بھی کھاؤ
آؤ پھول اور خوشبو کی طرح پیار کریں

محبتوں کے فاصلے

عطیہ داؤد

ترجمہ: فہمیدہ ریاض

میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلنا چاہتی ہوں سنگ تمہارے
جیون کی راہ پر
اور تم ناک میں نکیل ڈال کر مجھے کشاں کشاں لے جانا چاہتے ہو
میں پیار کے نشے میں سرشار
اپنا آپ تم پر نچھاور کرنا چاہتی ہوں
اور تم خدا بن کر مجھے توڑنا اور جوڑنا چاہتے ہو
میں پریت کی پائل چھنکاتی
تمہارے من آنگن میں رقص کرنا چاہتی ہوں
اور تم میری مجبوریوں کا راگ الاپ کر ضرورتوں کی ڈفلی پر
مجھے کٹھ پتلی کی طرح نچانا چاہتے ہو
میں خوشبو بن کر تمہارے وجود میں سمانا چاہتی ہوں
اور تم مجھے جیب میں ڈال کر پھرنا چاہتے ہوں

میں ان فاصلوں پر رونا چاہتی ہوں
اور تم چٹکی بجا کر مجھے ہنسانا چاہتے ہو

شرافت کا پل صراط

عطیہ داؤد
ترجمہ: فہمیدہ ریاض

میں تمام عمر چلتی رہی دوسروں کی گھڑی عذابوں کی پل صراط پر
بابا کی پگڑی
بھیا کی ٹوپی کی خاطر
میں نے سانس بھی ان کی مرضی سے لیا
اور جب باگ شوہر کو تھمائی گئی
تب سے چابی کے کھلونے کی طرح
اس کے اشارے پر ہنسی اور روئی

بچپن میں جس طرح بھوتوں سے خوف کھاتی تھی
اسی طرح اب طلاق سے ڈرتی ہوں

باپ نے جہیز میں بہشتی زیور دیا تھا
اس کا ہر لفظ سوت کی طرح میرے سینے پر مونگ دلتا ہے
میرے ذہن کا دم گھونٹ کر
جذبوں کے لہو میں قلم ڈبو کر
لکھے گئے ہیں عقیدے
مجھے نصف انسان جان کر
بنائے گئے ہیں قانون
اور سماج کی تعمیر کی گئی
ان کھوپڑیوں سے جو میری امنگوں کی ہیں

سزا کی منتظر ایک باغی لڑکی

بشریٰ اعجاز

میں اپنے قبیلے کا بے نام سا
بے نسب بے گماں ایک ورثہ اٹھائے
سیہ اور تنگ کڑوے کسیلے
رواجوں کے الجھے ہوئے دائرے میں کھڑی ہوں
مجھے مت پکارو
میں اپنے قبیلے کی ہوں باغی لڑکی
جو آنکھوں کی درزوں سے
تکنے کی مجرم ہے
اور جرم یہ ہے
کہ میں نے نئے سورجوں کی
کنواری سجل بانوری سی کرن کو
نگاہوں کی درزوں سے دل میں اتارا

میرا جرم یہ ہے
کہ میں نے اسیری سے نفرت بھی کی
جبر کے سامنے اپنا سر بھی اٹھایا
خود اپنی ہی آواز کے سامنے خود کو پایا

میں اپنے قبیلے کی ہوں باغی لڑکی
جو مہتاب کی نرم آمیزیوں کے بجائے
کڑی دھوپ کے راستے چن کے
ان پر چلی ہوں

میں سورج ہتھیلی پہ رکھ کے
سلگتی زمینوں پہ پھولی پھلی ہوں

میں اپنے قبیلے کی ہوں باغی لڑکی
جو اپنے جرائم کی مالا
سجا کر گلے میں
سزا در سزا دائروں میں چلی ہوں
مگر پھر بھی خواہش رہی ہے
کہ باہر بھی نکلوں

میں اس سمت جاؤں
جدھر راستے، راستوں سے ملیں
تو، نئی منزلوں کی بشارت بھی پاؤں

میں اپنے قبیلے کی ہوں باغی لڑکی
وہ جس نے گلابوں سے دامن بچا کر
ببولوں سے جھولی بھر لی
کہکشاں سے چمکتے ہوئے راستے چھوڑ کر
جو سلگتی ہوئی ریت پر آبلہ پا چلی
اور یہ راستہ اس نے خود ہی چنا تھا
جو آدرش کے کنکروں سے بھرا تھا

میں اپنے قبیلے کی ہوں باغی لڑکی
جو خوابوں کو پلکوں کی چلمن میں

رکھنے کی مجرم بنی
اور جسے خواب رستوں کی
تلخی بھری ساری تعبیروں کی بھی خبر تھی
مگر اس نے اپنے لئے
خواب رستے چنے
نیند کی اندھی کالی گلی میں
اندھیرے بھرے چند سپنے بنے
یہ الگ بات اس کو یہ معلوم تھا
اس کے خوابوں کو تعبیر کے سائبانوں کی چھاؤں
نہیں مل سکے گی
اسے عمر بھر ننگے سر، ننگے پاؤں
کڑی دھوپ میں یونہی چلنا پڑے گا

میں اپنے قبیلے کی ہوں باغی لڑکی
جو اپنے جرائم کے تمغے سجائے
خود اپنی **صلیبیں** اٹھائے
سزاؤں کے فرمان ہاتھوں میں لے کر کھڑی ہے
مگر محتسب
اس کے جرموں کی تفصیل سے ہیں گریزاں
کہ ان کے لبوں پر
خموشی کی مہریں لگی ہیں
وہ خود سے بھی نظریں چرائے کھڑے ہیں

ننگے پاؤں

بشریٰ اعجاز

مجھے نسلِ آدم کو آگے بڑھانے کا
بس اک وسیلہ نہ سمجھو
مرے جسم کو خواہشوں کی
تسکین کا صرف حیلہ نہ سمجھو
مرے واسطے جال
وعدوں کے اسرار
کیوں؟
میں تری نصف ہوں
مجھ کو اپنے جیسا
اک انسان سمجھو
میرے واسطے
کہکشاں توڑ کر
راستوں میں بچھانے کی
کوئی ضرورت نہیں
مجھے
بدیسی خوشبو میں لپٹی
باسی محبت کی کوئی تمنا نہیں
اس لئے کہ مجھے ننگے پاؤں
پتھروں سے بھرے راستوں پہ
چلنے کا فن آگیا ہے

میں عورت ہوں

بشریٰ اعجاز

میرے جسم کو،
خواہشوں کی سلگتی ہوئی
ریت میں
میرے پیارو دباؤ
مرے نام کو
لوحِ قسمت سے
آ کے مٹاؤ
مجھے دین و دنیا سے
خارج کرو
اور فقط
وسیلہ تسکین جانو
مرے تن بدن کے رتن
غرض کی منڈیوں میں
سوتر کی انٹی کے بدلے
میں بیچو
کہ میرے "حقوق بحقِ سرکار
صدیوں سے محفوظ ہیں"

نیلا بستر

بشریٰ اعجاز

میرے جسم پر اس کے ہاتھوں کا منتر
میری روح پر اس کے ہی جبر کا ڈنگ

میں تیرے عاق لاؤں تو کیسے کدھر سے
میرا سانپ میرے ہی بستر پر سویا پڑا ہے

آگہی

میرے پر کٹے ہیں
مگر
مجھ کو زنداں کے دیوار و در
باندھ کر بازوؤں سے
اڑنے کا ادراک ہے

اپنے بیٹے کے لئے ایک نظم

پروین شاکر

مرے بچے نے پہلی بار اٹھایا ہے قلم
اور پوچھتا ہے
کیا لکھوں ممّا؟
میں تجھ سے کیا کہوں بیٹے
کہ اب سے برسوں پہلے
یہ لمحہ جب مری ہستی میں آیا تھا
تو میرے باپ نے مجھ کو سکھائے تھے
محبت اور نیکی اور سچائی کے کلمے
مرے توشے میں ان لفظوں کی روٹی رکھ کے وہ سمجھا تھا
میرا راستہ کٹ جائے گا
آگے سفر آسان ہو جائے گا شاید!
محبت مجھ سے دنیا نے وصولی
قرض کی مانند
نیکی سود کی صورت میں
حاصل کی
مری سچائی کے سکے
ہوئے رد اس طرح سے
کہ میں فوراً سنبھلنے کی نہ گر تدبیر کرتی
تو سر پر چھت نہ رہتی
تن پہ پیراہن نہیں بچتا
میں اپنے گھر میں رہ کر

عمر بھر جزیہ ادا کرتی رہی ہوں!

زمانہ

میرے خدشوں سے سوا عیار تھا

اور زندگی

میری توقع سے زیادہ بے مروت تھی

تعلق کے گھنے جنگل میں

بچھو سرسراتے تھے

مگر ہم اس کو سرشاری میں

فصل گل کی سرگوشی سمجھتے تھے

پتہ ہی کچھ نہ چلتا تھا

کہ خوابوں کی چھپر کھٹ پر

لباس ریشمیں

کس وقت بن کر کینچلی اترا

مخاطب کے رو پہلے دانت

کب لمبے ہوئے

اور کان

کب پیچھے مڑے

اور پاؤں

کب غائب ہوئے یکدم!

میں اس کذب و ریا

اس بے لحاظی سے بھری دنیا میں رہ کر

محبت اور نیکی اور سچائی کا ورثہ

تجھ کو کیسے منتقل کر دوں

مجھے کیا دے دیا اس نے!
مگر میں ماں ہوں
اور اک ماں اگر مایوس ہو جائے
تو دنیا ختم ہو جائے
تو میرے خوش گماں بچے!
تو اپنی لوحِ آئندہ پہ
سارے خوبصورت لفظ لکھنا
احسان کرنا
پیار بھی کرنا
مگر آنکھیں کھلی رکھنا!

بشیرے کی گھر والی

پروین شاکر

ہے رے تیری کیا اوقات!
دودھ پلانے والے جانوروں میں
اے سب سے کم اوقات
پرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا
اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی
جب ماں جایا پھلداری میں تتلی ہوتا
تیرے پھول سے ہاتھوں میں
تیرے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی
ماں کا آنچل پکڑے پکڑے
تجھ کو کتنے کام آ جاتے
اپلے تھاپنا
لکڑی کاٹنا
گائے کی سانی بنانا
پھر بھی مکھن کی ٹکیہ
ماں نے ہمیشہ بھیا کی روٹی پہ رکھی
تیرے لئے بس رات کی روٹی
رات کا سالن
روکھی سوکھی کھاتے
موٹا جھوٹا پہنتے
تجھ پہ جوانی آئی تو
تیرے باپ کی نفرت تجھ سے اور بڑھی

تیرے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پر
ایسی کڑی نظر رکھی
جیسے ذرا سی چوک ہوئی
اور تو بھاگ گئی
سولھواں لگتے ہی
ایک مرد نے اپنے من کا بوجھ
دوسرے مرد کے تن پہ اتار دیا
بس گھر اور مالک بدلا
تیری چاکری وہی رہی
بلکہ کچھ اور زیادہ
اب تیرے ذمے شامل تھا
روٹی کھلانے والے کو
رات گئے خوش بھی کرنا
اور ہر ساون گا بھن ہونا
پورے دنوں سے گھر کا کام سنبھالتی
پتی کا ساتھ
بس بستر تک
آگے تیرا کام!
کیسی نوکری ہے
جس میں کوئی دیہاڑی نہیں
جس میں کوئی چھٹی نہیں
جس میں الگ ہو جانے کی، سرے سے کوئی ریت نہیں
ڈھوروں ڈنگروں کو بھی
جیٹھ اساڑھ کی دھوپ میں

پیڑ تلے ستانے کی آزادی ہوتی ہے
تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سمے نہیں
تیری جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے
ہے رے!
کن کرموں کا پھل ہے تو
تن بیچے تو کسبی ٹھہرے
من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے
سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا
کب تک یہ اپمان
ایک نوالہ روٹی،
ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان!

موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والی

شبنم شکیل

اس تماشا گاہ کے
خوف کے حصار میں
دیکھنا بھی جرم تھا
چیخنا بھی جرم تھا
سوچنا بھی جرم تھا
چھپ کے ناظرین سے
چھپ کے سامعین سے
چھپ کے آسمان سے
چھپ کے اس زمین سے
دیکھتی بھی تھی مگر
چیختی بھی تھی مگر
سوچتی بھی تھی مگر
وہ کہ جس کی زندگی
گول گول گھومتے
دائروں میں کٹ گئی

غزل

شبنم شکیل

دکھ کا منتر پڑھی ہوئی ہوں
میں غربت میں بڑی ہوئی ہوں

ان میں وقت ہی ضائع ہو گا
جن باتوں میں پڑی ہوئی ہوں

راج سنگھاسن ہے یہ میرا؟
یا سولی پر چڑھی ہوئی ہوں

آدھی ریت سے باہر ہوں میں
آدھی ریت میں گڑی ہوئی ہوں

آدھی مان چکی ہوں اس کی
آدھی بات پہ اڑی ہوئی ہوں

مجھ کو گرانا سہل نہیں ہے
اپنے سہارے کھڑی ہوئی ہوں

ایک دفعہ کا ذکر ہے

شبنم شکیل

ملی تھی مجھ کو اک بوڑھی طوائف ایک محفل میں
جو خود پیشہ نہیں کرتی تھی' اک چکلا چلاتی تھی
مرے جیسی گھریلو بیویوں کے دل جلاتی تھی
تھی اس کے ساتھ اک من موہنی سی نوجواں لڑکی
جو اس رنگین محفل میں برائے رقص آئی تھی
کہ صاحب خانہ کو صورت اس البیلی کی بھائی تھی
یونہی بس اتفاقاً" دونوں میرے پاس آ بیٹھیں
بہت ہی زعم میں تھی میں کہ اپنی پاکبازی کے
ذرا سی دیر میں اوقات ان کی ان کو سمجھا دی
بہت سا بوجھ لے کر پھر رہی ہو تم گناہوں کا
حساب عاقبت کا خوف بھی تم کو نہیں آتا
یہ سن کر رنگ جیسے اڑ گیا لڑکی کے چہرے کا
ندامت سے سر اس کا جھک گیا بھر آئیں آنکھیں بھی
مگر بڑھیا جو ناچ اوروں کو تگنی کا نچاتی تھی
نظر بازوں کو جو گھر بار کی سدھ بدھ بھلاتی تھی
تاثر لینے والی تھی بھلا وہ ایسی باتوں کا
ہنسی پہلے تو وہ اپنے مسی آلود ہونٹوں سے
مرے کانوں میں پھر بولی وہ سرگوشی کے لہجے میں
"یہاں پر ناچنا پڑتا ہے سب کو پیٹ کی خاطر
ہمیں غیروں کے آگے تم کو شوہر کے اشاروں پر"

ورثہ

شبنم شکیل

بہت آسان سی راتیں بہت آسان سے دن ہیں
نہ بے کل دن میں رہتی ہوں نہ شب کی نیند اڑتی ہے
نہایت چین سے آرام سے اپنی گزرتی ہے
کہ اب دامن میں گنجائش نہیں انگار جذبوں کی
مقرر راستے پر کاروان زیست چلتا ہے
مخالف یا موافق ہو ہوا راحت نہیں دیتی
برس کر ابر کھل جائے پر اب روزن نہیں کھلتا
شگفت گل پہ بھی زنجیرپا حرکت نہیں کرتی
گلوں کو توڑ کر گلدان میں ایسے سجاتی ہوں
کہ جیسے فرض ہو کوئی جسے انجام دینا ہے
نہیں ہے کوئی بھی مطلب مجھے مہتاب راتوں سے
ستارے جو سخن کرتے ہیں ان باتوں سے کیا لینا
بھرا ہو کہ یا خالی آسماں معنی نہیں رکھتا
مجھے بے سود باتوں سے نہیں اب کوئی دلچسپی
کتابیں پاس ہیں لیکن انہیں میں پڑھ نہیں سکتی
وہ اک ترتیب سے رکھی بھلی معلوم ہوتی ہیں
کہاں ہیں وہ جو میرے پاس تصویریں پرانی تھیں
تھے کچھ خط بھی جنہیں میں نے بہت پہلے جلا ڈالا

۲

نئے اب قاعدے قانون دنیا نے سکھائے ہیں

''ثبوت طبع ناقص ہے بلند آواز میں ہنسنا''
''پرندے چہچہاتے ہیں تو کتنا شور اٹھتا ہے''
''گزرنا حد سے الفت میں کبھی اچھا نہیں ہوتا''
''اصولوں پر بھی سمجھوتا روا ہوتا ہے دنیا میں''
ہو کوئی فیصلہ جذبات میں آ کر نہیں کرتی
اسی میں خیر ہے شاید اسی میں بہتری میری
مٹا ڈالا ہے اب دل سے وہاں جو نام کندہ تھا
جسے سن کر کبھی یہ دل دھڑکنا بھول جاتا تھا
نہیں اب میری دنیا میں کچھ ان چیزوں کی جا باقی

۳

یہ سب اچھا سہی لیکن نہ جانے کس لئے پھر بھی
میں اکثر دل ہی دل میں سوچ کر کچھ کانپ اٹھتی ہوں
کہ اب میری شباہت کی مری نازوں پلی بیٹی
مری سب ترک کردہ سوچ کے بے کار ورثے کو
اکٹھا کر رہی ہے اور جھولی بھرتی جاتی ہے

چادر اور دیواری

فہمیدہ ریاض

حضور میں اس سیاہ چادر کا کیا کروں گی
یہ آپ کیوں مجھ کو بخشتے ہیں، بصد عنایت!

نہ سوگ میں ہوں کہ اس کو اوڑھوں
غم و الم خلق کو دکھاؤں
نہ روگ ہوں میں کہ اس کی تاریکیوں میں خفت سے ڈوب جاؤں
نہ میں گنہ گار ہوں نہ مجرم
کہ اس سیاہی کی مہر اپنی جبیں پہ ہر حال میں لگاؤں
اگر نہ گستاخ مجھ کو سمجھیں

اگر میں جاں کی امان پاؤں
تو دست بستہ کروں گزارش
کہ بندہ پرور!
حضور کے حجرہ معطر میں ایک لاشہ پڑا ہوا ہے
نہ جانے کب کا گلا سڑا ہے
یہ آپ سے رحم چاہتا ہے
حضور اتنا کرم کیجئے
سیاہ چادر مجھے نہ دیجئے

سیاہ چادر سے اپنے حجرہ کی بے کفن لاش ڈھانپ دیجئے

کہ اس سے پھوٹی ہے جو عفونت
وہ کوچے کوچے میں ہانپتی ہے
وہ سر پٹکتی ہے چوکھٹوں پر
برہنگی اپنی ڈھانکتی ہے
سنیں ذرا دلخراش چیخیں
بنا رہی ہیں عجب ہیولے

جو چادروں میں بھی ہیں برہنہ
یہ کون ہیں؟ جانتے تو ہوں گے
حضور پہچانتے تو ہوں گے!
یہ لونڈیاں ہیں!
کہ یرغمالی حلال شب بھر رہیں
دم صبح در بدر ہیں
یہ باندیاں ہیں!

حضور کے نطفہ مبارک کے نصب ورثہ سے معتبر ہیں
یہ بیبیاں ہیں!
کہ زوجگی کا خراج دینے
قطار اندر قطار باری کی منتظر ہیں
یہ بچیاں ہیں!
کہ جن کے سر پر پھرا جو حضرت کا دست شفقت

تو کم سنی کے لہو سے ریش سپید رنگین ہو گئی ہے
حضور کے حجلہ معطر میں زندگی خون رو گئی ہے

پڑا ہوا ہے جہاں یہ لاشہ
طویل صدیوں سے قتل انسانیت کا یہ خوں چکاں تماشا
اب اس تماشا کو ختم کیجئے
حضور اب اس کو ڈھانپ دیجئے!
سیاہ چادر تو بن چکی ہے مری نہیں آپ کی ضرورت

کہ اس زمیں پر وجود میرا نہیں فقط اک نشان شہوت
حیات کی شاہراہ پر جگمگا رہی ہے مری ذہانت
زمیں کے رخ پر جو ہے پسینہ تو جھلملاتی ہے میری محنت
یہ چار دیواریاں، یہ چادر، گلی سڑی لاش کو مبارک
کھلی فضاؤں میں بادباں کھول کر بڑھے گا مرا سفینہ
میں آدم نو کی ہم سفر ہوں
کہ جس نے جیتی مری بھروسا بھری رفاقت!

ایک لڑکی سے

فہمیدہ ریاض

سنگدل رواجوں کی
یہ عمارت کہنہ
اپنے آپ پر نادم
اپنے بوجھ سے لرزاں
جس کا ذرہ ذرہ ہے
خود شکستگی ساماں
سب خمیدہ دیواریں
سب جھکی ہوئی کڑیاں

سنگدل رواجوں کے
خستہ حال زنداں میں!
اک صدائے مستانہ!
ایک رقص رندانہ!
یہ عمارت کہنہ ٹوٹ بھی تو سکتی ہے
یہ اسیر شہزادی چھوٹ بھی تو سکتی ہے

یہ اسیر شہزادی ــــــــ

جبر و خوف کی دختر
واہموں کی پروردہ

مصلحت سے ہم بستر
ضعف و یاس کی مادر
جب نجات پائے گی سانس لے گی درانہ
محو رقص رندانہ
اپنی ذات پائے گی

تو ہے وہ زن زندہ
جس کا جسم شعلہ ہے
جس کی روح آہن ہے
جس کا نطق گویا ہے
بازوؤں میں قوت ہے
انگلیوں میں صناعی
ولولوں میں بیباکی
لذتوں کی شیدائی
عشق آشنا عورت
وصل آشنا عورت
مادر خداوندی
آدمی کی محبوبہ

کب تک

فہمیدہ ریاض

کب تک مجھ سے پیار کرو گے
کب تک؟
جب تک میرے رحم سے بچے کی تخلیق کا خون بہے گا
جب تک میرا رنگ ہے تازہ
جب تک میرا انگ تنا ہے
پر اس سے آگے بھی تو کچھ ہے
وہ سب کیا ہے
کسے پتہ ہے
وہیں کی ایک مسافر میں بھی
انجانے کا شوق بڑا ہے
پر تم میرے ساتھ نہ ہو گے تب تک

مقابلہ حسن

فہمیدہ ریاض

کولھوں میں بھنور جو ہیں تو کیا ہے
سر میں بھی ہے جستجو کا جوہر
تھا پارہ دل بھی زیر پستان
لیکن مرا مول ہے جو ان پر
گھبرا کے نہ یوں گریز پا ہو
پیمائش میری ختم ہو جب
اپنا بھی کوئی عضو ناپو!

گفتگو شاہین خوش خصال و شیریں مقال

فہمیدہ ریاض

کہنے لگے ایک بلند پرواز شاہین
اک مور سے
کہ اے مور!
جنگل کو اگر تو چاہتا ہے
آخر اس کا ثبوت کیا ہے
تو نے کوٹھی نہیں بنائی
جھوٹی صنعت نہیں لگائی
معصوموں کو کیا نہ اغواء
لوٹا نہیں مال بے کسوں کا
بینکوں سے بھی لیا نہ قرضہ
اربوں کھربوں حساب جس کا
اے مور!
خدا کی تجھ پہ ہو مار
ثابت یہ ہوا کہ تو ہے غدار
اور تو شاطم دین ضرور ہو گا
اور یہ بھی ہے اطلاع خفیہ
تیرے دل کو نہیں بھاتا
جنگل کے نظام کا نظریہ
پس کیوں نہ کریں تجھے گرفتار

یا بھوکا کیوں نہ دیں تمہیں مار
اس رقص سے کیا ہمیں سروکار
منہ اپنا سالے کہ رہ گیا مور
تھا اس میں کہاں اڑان کا زور
سنکر شاہین کی آہ و زاری
کرگس پہ خلال کر کے بولا
خرگوش گلہریاں' چکارے
پھرتے ہیں بلوں میں مارے مارے
ان کا نہ کبھی شکار کرنا
بس سارے کو ڈمی کار کرنا
بارش میں ناچتا ہے بدمست
سبکا اخلاق کر دیا پست
جنگل کے درمیان یہ جب تھا
تب میں ہی اس کا محتسب تھا
مانگی تھی مختصر کمیشن
وہ بھی تو نہ اس سے پڑ سکی بن
ہیں مور وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

کلام میں آنچ کیوں نہیں ہے

فہمیدہ ریاض

کلام میں آنچ کیوں نہیں ہے
وہی تو ہم ہیں وہی تو تم ہو
تو پھر یہ کیا ماجرا ہے یارو
کہ سرد لفظوں کے برف زاروں میں
کارواں دل کہ در بدر ہیں

وہی سخن کل جو کہ گفتنی تھے
جو آج ناگفتنی ہوئے ہیں

محال ہے جن کا لب پہ لانا
بدل گیا اسقدر زمانہ
سخن جنوں کے سخن وفا کہ
ستائش جرات و سفا کہ
اور سخن جو انصاف کی طرف تھے
کسی کے جھوٹے لبوں پہ بھی آ گئے
تو اس کا بڑھا تھا رتبہ
کہ باعث عزت و شرف تھے

مگر وہ کار بندگاں نو کی نگاہ میں معتبر نہیں ہیں
اب ان کی توقیر اٹھ گئی ہے

سروں سے چادر اتر گئی ہے
یہ سرنگوں کس طرف کو جائیں
نہ جی سکیں گے نہ مر سکیں گے
یہ اتنے زندہ ہیں اتنے تازہ
انھیں نہ ہم دفن کر سکیں گے
اب اس کا کیا کیجئے
کہ روشن ہے جس سے ہستی کا دشت ویراں
وہ ماہ کامل نہیں بدلتا
کچھ ایسی قدریں ہیں زندگی کی
کہ جن کا حاصل نہیں بدلتا
وہ خلق کا دل ہو یا وہ شاعر کا دل
سو یہ دل نہیں بدلتا

تیسرا حصہ

افسانے

بارہ آنے کی عورت

بشریٰ اعجاز

جنگل کے اندھیرے میں سکوت کو توڑتی اس کی آواز کی بازگشت گونج رہی تھی۔ ٹاہلی، کیکر اور بیری کے درخت کرب سے دوہرے پڑ گئے تھے۔ یہ کون ہے؟ پتوں نے سرگوشی کی۔ کیکر کی پھلیوں نے ایک دوسرے کی جانب حیرت سے دیکھا۔ یہ کون ہے؟ زمین پر بے ترتیبی سے بکھرے خشک پتوں نے آواز کو سن کر کہا۔ زمین پر اس کے قدموں کی تاپ سے تھرتھلی سی مچ گئی۔

میں کون ہوں؟ اس نے اندھیرے اور سکوت کے اس مکمل پن میں چلاتے ہوئے خود سے سوال کیا۔ زمینوں اور آسمانوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے، سب کی حیثیت اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سب کی شناختیں اور روپ ہیں مگر میں، وہ کرب سے کراہی، آخر اتنی بے نام و بے وجود کیوں، میری شناخت کدھر ہیں۔ میرے بال و پر کس نے کاٹے، کس نے میرے شانے پر اپنی مرضی کے سر سجائے۔ میری پیشانی پر حرف لکھے اور مٹائے۔ کیوں آخر کیوں؟

وہ ایک بوڑھی ٹاہلی کے کھوکھلے تنے سے ٹیک لگائے بری طرح ہانپ رہی تھی۔ سویا ہوا جنگل خواب غفلت سے بیدار ہو کر آنکھیں ملتا ہوا اس شور کا سبب جاننے کے لئے بے چین تھا۔ کیا ہوا؟ سب کے لبوں پر استفسار، کیا ہوا؟ سب نے سوالوں کے بینر اٹھا لئے۔ ناگواری کا اظہار سب طرف سے تھا، کون ہے؟ اک دیوانی ہے، ماں نے بچے کو تھپکتے ہوئے بیزاری سے کہا، اندر نہ آ جائے، بچہ ڈر گیا۔ سوجا، سوجا، نہیں آتی۔ وہ ابھی اپنے آپ میں مصروف ہے۔ یہاں کیا آئے گی۔ چڑیا ماں نے کھلے دروازے سے باہر جھانکا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ الو اپنی جگراتے کی عادت کی وجہ سے نہایت مطمئن بیٹھا چونچ سے گردن کھجا رہا تھا، ان نیند کے ماتوں کو سوتی جاگتی کیفیت میں دیکھ کر دھیرج کے انداز میں نجانے انہیں کون سی مت دے

رہا تھا۔ نیند کے سائے اس کے اردگرد بیٹھے مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے سر ہلا رہے تھے۔ جنگل کا سکوت مدھم مدھم شور میں بدل چکا تھا۔ آواز کی بازگشت جنگل کے پیڑوں کے سینے سے ٹکراتی، ٹہنیوں، پتوں، پھلوں کو چھوتی، گھونسلوں اور بکھنوؤں سے الجھتی نجانے آسمان کی کون سی سمتوں کی جانب نکل گئی تھی کہ اب سوائے وحشت ناک اداسی کے وہاں اور کچھ نہ تھا۔ بوڑھی ٹاہلی کے کھوکھلے تنے سے لگی وہ خالی خالی نظروں سے گھپ ہنیوے میں نجانے کسے کھوج رہی تھی۔

شہباز میرے اندر جھانکنے کی کوشش کبھی نہ کرنا، وہاں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا، میں تو وہ سوکھی ہوئی ڈالی ہوں جس کی تہوں سے بھی پانی کا قطرہ نہیں ملتا، اب وہاں گزرے وقت کی اچھی بری یادوں کا جھاڑ جھنکار ہے، اندھیرا ہے اور تنہائی ہے۔ اگر میں جھانکنا چاہوں تو، شہباز معنی خیز انداز میں بولا۔ تمہاری مرضی۔ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ جا رہی ہو۔ ہاں۔ رک جاؤ۔ آگے بڑھ کر روک لو، اس نے عجیب سے لہجے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی بات پر شہباز کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ لمحے بھر کو تھرتھرایا۔ اس نے پاس رکھی کرسٹل ایش ٹرے میں راکھ نفاست سے جھاڑتے ہوئے ثمر کی طرف دیکھا۔ جو اس کے سامنے تنی کھڑی تھی۔ اس کی بات سن کر وہ اٹھا۔ اسے بازو سے پکڑ کر جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ ثمر، اس کے کانوں میں سرگوشی گونجی، مت جاؤ۔ میرے پاس رہو۔ وہ اس کی بانہوں کے حلقے میں اس کے کندھے سے لگی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ شہباز کے وجود سے اٹھنے والی کسی مہنگے کولون کی دھیمی دھیمی خوشبو اسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے جسم سے نکلنے والی حرارت جیسے براہ راست اس کے جسم میں منتقل ہو رہی تھی۔ اس کا اک اک مسام اس حرارت کی پذیرائی خوشدلی سے کر رہا تھا۔ اس کے اندر دور تک درد بھری خمار آلود آواز اس کی قربت کی دل نواز مہک بھر گئی تھی۔ ثمر دل نہیں بھرتا۔ تمہاری قربت اور بھی پیاسا بنا ڈالتی ہے۔ جتنا پی لو۔ طبیعت سیر ہی نہیں ہوتی۔ یار شاید تم آگ سے بنی عورت ہو۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو پھر آگ کو سمیٹے کیوں کھڑے ہو؟ ارے واہ! تم سمیٹنے کی بات

کرتی ہو۔ میں تو اس کے شعلوں میں جھلسنا چاہتا ہوں۔ اسے اور بھی بھڑکانا چاہتا ہوں۔ جلنا چاہتا ہوں۔ جلتے رہنا چاہتا ہوں۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سرشاری سے کہا۔ ثمر نے اپنی بوجھل آنکھیں بمشکل کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ شہباز کی سرخ آنکھیں اور اس کے سانولے چہرے پر ان دیکھے شعلوں کا ناچ دیکھ کر اسے لوہے کی مل کی وہ بڑی سی بھٹی یاد آئی جس میں ہزاروں ٹن لوہا ڈال کر پگھلایا جاتا تھا۔ اس میں جتنا بھی لوہا ڈال دو نجانے پل ہی پل میں کدھر غائب ہو جاتا تھا۔ کسی خون آشام درندے کی طرح اس کا پیٹ لمحوں میں سب کچھ نگل لیتا۔ وہ بچپن میں کبھی کبھار اپنے بابا کی انگلی پکڑے اس بھٹی کو دیکھنے جایا کرتی تھی۔ جس کے کنارے پر اتنی تپش ہوتی کہ وہاں کھڑے ہونا محال ہوتا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو جلنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔ آگ اس کے پاؤں سے ہوتی ہوئی سر تک آن پہنچی اور پھر وہ پور پور شعلوں میں جلنے لگی۔ بھڑبھڑ بھڑ۔

سمن آباد کی پرانی طرز کی ایک کوٹھی کی پچھلی طرف والے پورشن کے ایک کمرے میں پلنگ پر دو بالترتیب تین اور چار سال کی عمر کی بچیاں سوئی ہوئی تھیں۔ ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز کمرے کی خاموشی میں ایک تواتر کے ساتھ گونج رہی تھی۔ چھت پر لگا ہوا برقی پنکھا جس کا رنگ کسی زمانے میں تو سفید رہا ہو گا مگر جو پرانا ہونے کی وجہ سے میلا ہو کر پیلا پڑ گیا تھا۔ گھڑگھڑ کی آواز سے چل رہا تھا۔ دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ کوٹھی کے دوسرے حصے سے لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو سب سے پہلے اس کی نظر امین صاحب پر پڑی۔ وہ گھر کی تمام ردی جمع کئے ردی فروش کو بیچ رہے تھے۔ اس نے نظر بچا کر نکلنا چاہا۔ ثمر! بیٹا تم رات سے کدھر تھیں؟ امین صاحب کی آواز نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ انکل میری سہیلی کی طبیعت بہت خراب تھی اس کے ساتھ ہوسٹل میں تھی۔ مگر تم نے شام کو ذکر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے مشکوک انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ امین انکل اس کی طبیعت رات کو زیادہ بگڑ گئی تو مجھے جانا پڑا۔ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ مجھے کہنا تو نہیں چاہئے بیٹی مگر میں

بڑا ہونے کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں برا مت ماننا کہ مجھے رات کو تمہارا بچوں کو چھوڑ کر اس طرح جانا اچھا نہیں لگتا۔ امین صاحب گو اس کے کرائے دار تھے مگر وہ انہیں اپنا مہربان اور بزرگ سمجھ کر ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس وقت ان کے سامنے وہ بری طرح شرمندہ ہو رہی تھی۔ سوری انکل! اس نے سر جھکا کر کہا اور اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ امین صاحب چند لمحے تاسف سے اسے جاتا دیکھتے رہے اور پھر دوبارہ ردی والے کی طرف متوجہ ہو گئے جو کاپیوں کے ورق اور گتے بڑی مہارت سے الگ الگ کر رہا تھا۔

اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے کمرے کا تالا کھولا اور دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ بچیوں کو پرسکون انداز میں سوتا دیکھ کر طمانیت بھری گہری سانس لیتے ہوئے وہ پاس بچھے پلنگ پر دراز ہو گئی۔ اس کا جوڑ جوڑ تھکاوٹ' سرشاری اور جگراتے کی لذت اور بے لذتی کے عجب ملے جلے احساس سے چور چور تھا۔ شہباز سے ملنے سے قبل اور ملنے کے دوران وہ عجیب قسم کی بے چینی اور انتشار کا شکار رہتی تھی۔ وہاں جا کر اسے لگتا جیسے گھر اور اس کے درمیان آگ کا اک ناقابل عبور سمندر حائل ہو اور اس سمندر کے پار اس کا چھوٹا سا گھر اور بچیاں بھی اسی آگ کی لپیٹ میں آ چکی ہوں اور جب وہ جائے گی تو وہاں فقط راکھ ہو گی اور کچھ بھی نہ ہو گا۔ ہاں مگر جب وہ واپس آتی' بچوں کو بخیریت دیکھ لیتی تو نجانے کیوں اسے شہباز بڑی شدت سے یاد آنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا وہ پر لگا کر اڑ جائے اور اس آگ تیل اور شعلوں بھری دنیا کا حصہ بن جائے۔

ریاض سے بھرپور عشق اور خاندان بھر کی ناراضگی مول لے کر دھڑلے سے شادی کرنے کے بعد وہ بڑے مزے سے جی رہی تھی۔ مینا اور صائمہ کی پیدائش کے بعد تو وہ اپنے آپ کو مکمل سمجھ کر سارے جہان کی طرف سے آنکھیں بند کر بیٹھی۔ ارے محترمہ کبھی اپنے اس طلب گار پر بھی نظر کرم ڈال لیا کیجئے۔ آخر اس بیچارے کا بھی آپ کے سوا اور کون ہے۔ وہ بچوں میں بری طرح الجھی ہوئی ثمر کی طرف شرارت بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے کہتا۔ وہ ہنس پڑتی۔ اس کی آنکھوں میں

ستارے ناچنے لگتے' ریاض! پلیز مجھے کام کرنے دو۔ لاؤ تمہارا کام میں کر دیتا ہوں۔ تم میرا کر دو۔ کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ بچے میری ذمہ داری اور میں تمہاری۔ ان کو بہلانا میرا کام اور مجھے بہلانا آپ کا کام۔ اس کی نظروں میں اتنی میٹھی میٹھی پکار ہوتی کہ اس کا دل چاہتا وہ بولتا رہے' بولتا رہے' یہاں تک کہ اسرافیل صور پھونکنا شروع کر دے۔ زمین پھٹ جائے۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگیں اور وہ میدان حشر میں ریاض کا ہاتھ تھامے سر جھکائے حاضر ہو جائے۔ یا اللہ مجھے جنت کے بدلے ریاض کی ہمراہی دے دے۔ بعض خواہشیں اپنی جگہ اتنی محترم و معتبر ہوتی ہیں کہ قسمتیں لکھنے والا بھی انہیں توقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مگر اس نے دنیا بھی تو چلانی ہوتی ہے۔ تغیرات و تبدل کے بغیر جہاں کیسے چلے اور پھر آزمائشوں کے بغیر جینے کا مزہ کہاں۔ اسی لئے ثمر کی زندگی کی وہ آزمائش شروع ہو گئی جس کا تصور بھی کبھی اس کے لئے محال تھا۔

ریاض پر بیٹھے بٹھائے باہر جانے کا جنون سوار ہو گیا۔ اچھی بھلی نوکری پر لات مار کر وہ امریکہ گرین کارڈ حاصل کر کے سیٹل ہو جانے کے جنون میں اسے روتا بلکتا چھوڑ کر پی آئی اے کے جمبو جیٹ میں پرواز کر گیا۔ وہ دونوں بچیوں کو انگلیوں سے لگائے جہاز کو اونچا اور اونچا اڑتا دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اس نے آس پاس نظر دوڑائی ایئرپورٹ پر اس کے سوا کوئی بھی ایسا نہ تھا جو جہاز کے اوجھل ہو جانے کے بعد بھی ہاتھ ہلا رہا ہو۔ ریاض سدا کا جلد باز اس نے ثمر کو اپنانے میں بھی اتنی جلدی دکھائی تھی کہ اسے کچھ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ اسی طرح اس نے اسے چھوڑنے میں بھی اتنی جلد بازی دکھائی کہ وہ عرصہ تک گم صم بیٹھی سوچتی رہی کہ آخر یہ سب کیا اور کیوں ہوا؟ ریاض کے جانے کے چھ ماہ کے بعد شام کے جھٹپٹے میں جب وہ بچیوں کے ساتھ قریبی پارک سے واپس آ رہی تھی کہ اسے گیٹ کے پاس خاکی کپڑوں میں ملبوس ڈاکیا نظر آیا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے قریب پہنچی۔ ریاض کا خط کھول کر دیکھنے کی جلدی میں اسے صائمہ اور مینا بھی بھول گئیں جنہیں بعد میں ڈاکیا گھر کے اندر لایا۔ خط پڑھتے پڑھتے اسے چکر آ گیا۔ اس کی

آنکھیں خط کے حروف پڑھنے سے انکار کر رہی تھیں۔ سطریں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ وہ سر کو تھامے گیٹ کے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔ ریاض نے گرین کارڈ کے حصول کے لئے امریکن لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ ثمر مجھے مجبوراً" امریکہ میں سیٹل ہونے کے لئے جینی سے شادی کرنی پڑی۔ میں اب بھی تمہارا ہوں فکر مت کرنا۔ گرین کارڈ ملتے ہی میں اسے فارغ کر دوں گا۔ اس نے خط کا پرزہ پرزہ کرتے ہوئے ساتھ ہی اس عشق کو بھی لیرلیر کر دیا جو اسے ریاض سے تھا۔ سارا منظر بدل گیا۔ زمین بدل گئی آسمان بدل گیا۔ وہ صائمہ اور مینا کا ہاتھ تھامے ننگے پیر جلتی زمین پر چلتی رہی چلتی رہی یہاں تک کہ اک موڑ پر اسے شہباز کھڑا نظر آیا۔

وہ پارک میں بچوں کی تصویریں اتارتا ہوا جب صائمہ مینا کے قریب پہنچا تو اسے ان کے پاس بینچ پر دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں اداس چہرے کی صلاحیتیں سمیٹے سوچوں میں گم ثمر نظر آئی۔ اداس حسن بے نیاز روپ۔ شہباز نے بچوں کی تصویریں اتارتے اتارتے ایک دم سے کیمرے کا رخ ثمر کی طرف پھیر دیا۔ اک جھماکا ہوا، روشنی کا کوندا لپکا، ثمر نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ بنا کچھ کہے وہ آگے بڑھی اور مسرور کھڑے شہباز کے ہاتھ سے کیمرہ چھین کر پوری طاقت سے بینچ پر پٹخ دیا۔ پھر بچوں کو ساتھ لئے خراماں خراماں یوں آگے بڑھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حیران شہباز ششدر سا ہو کر اس کی پشت کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بلاشبہ یہ اک مکمل عورت ہے اس نے خود سے کہا۔

ڈارک روم میں دو گھنٹے گھسے رہنے کے بعد ہاتھ میں تصویر تھامے باہر آیا تو اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک کے ساتھ ساتھ اضطراب بھی تھا۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ تصویر سینے پر رکھے نجانے کب اس کی آنکھیں مند گئیں۔

ریاض نے اس خط کے بعد اپنی کوئی خبر نہ دی۔ اس نے اپنا سامان گھر کے پچھلی طرف کے پورشن میں شفٹ کر کے، سامنے والا پورشن کرائے پر چڑھا دیا۔ وقت گزرنے لگا رینگ رینگ کر۔ نجانے وقت کا وہ کونسا کمزور لمحہ تھا جب ثمر کی گرفت اپنے آپ پر ڈھیلی پڑ گئی اور گھات میں بیٹھے شہباز نے اسے اچک لیا۔ شروع شروع

میں تو وہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹاتی اک تماشائی کی طرح خود کو دیکھتی رہی۔ ثمر ریاض یہ تو ہے' وہ پوچھتی۔ نہیں تماشائی ثمر اطمینان سے جواب دیتی میں تو یہاں ہوں۔ پھر نجانے کس طرف سے اچانک اک ہیولہ نمودار ہوتا جس کی شکل ریاض سے ملتی ہوتی۔ وہ شہباز کی قربت میں پیلی پڑ جاتی۔ ٹھنڈی ٹھار ہو کر اجنبی اجنبی نظروں سے چاروں طرف دیکھتی۔ کیا ہوا۔ اس کے چہرے کی زردی اور پیشانی پر پسینے کے قطرے دیکھ کر شہباز حیرت سے پوچھتا۔ مجھے گھر جانے دو۔ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیختی اور تکئے میں منہ چھپا کر بری طرح رونے لگتی۔ حیران شہباز اسے بہلانے کے جتن میں لگ جاتا۔ شہباز کی توجہ اور قربت نے آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے صدمے اور خوف کا اثر کھرچ دیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو مکمل طور پر شہباز کے سپرد کر دیا۔ اپنے سارے اختیارات اسے خاموشی سے سونپ کر خود اس کی قربتوں کی چادر تان کر گہری نیند سو گئی۔

مجھے مت جگانا۔ مجھے نیندوں کی دنیا سے واپس مت بلانا۔ سونے دو۔ مجھے سونے دو۔ کسی نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ دونوں بچیاں بھی کھٹکے سے جاگ گئیں۔ دروازہ کھولا تو سامنے امین صاحب کی نوکرانی شمو کھڑی تھی۔ بی بی جی آپ کا فون ہے۔ کس کا ہے؟ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ شہباز صاحب کا ہے جی! اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔ بی بی جی جلدی آئیں ایسا نہ ہو فون بند ہو جائے۔ شمو معنی خیز انداز میں بولی۔ شہباز نے اسے بلایا تھا۔ اب وہ اکثر اسی طرح اسے فون کر کے اپنے فلیٹ پر بلاتا تھا۔ دن ہو یا رات جب بھی وہ آتا اسے فون کر دیتا۔ وہ چوروں کی طرح فون ریسیو کرتی۔ امین صاحب کو اس نے اسے اپنا قریبی عزیز بتایا ہوا تھا۔ وہ چہک کر کہتا۔ ثمر میں آ گیا ہوں۔ تو پھر' پھر یہ کہ جیسی ہو جس حال میں ہو آ جاؤ۔ مگر شہباز بچے! ارے بچوں کو ہمسایوں کے حوالے کر آؤ۔ ہمسائے کب تک میرے بچوں کو سنبھالیں اور اب تو وہ لوگ بھی کترانے لگے ہیں۔ دوسرے میرا اس طرح سے آئے روز کئی کئی گھنٹوں کے لئے غائب ہونا سب کو

مشکوک کر رہا ہے۔ وہ روہانسی ہو کر کہتی۔ مجھے کچھ نہیں پتہ۔ میں تمہارے لئے یہاں آتا ہوں۔ صرف تمہارے لئے اور تم ہو کہ مجھے ملنا بھی نہیں چاہتی۔ بس مجھے میری ثمر چاہئے جیسے بھی ہو بس وہ مجھے دلا دو۔ بچوں والی ضد اور اٹل لہجہ۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چل دیتی۔ شہباز دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ' جب پہلی بار اسے شہباز کے شادی شدہ ہونے کا پتہ چلا تو بہت دیر وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے ایسا لگا جیسے سینے میں کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ پھر آہستہ سے خود کو یہ کہہ کر سمجھا لیا میں بھی تو شادی شدہ ہوں۔ دو بچوں کی ماں ہوں اور تاحال ریاض کی منکوحہ ہوں۔ مجھے ریاض نے چھوڑ دیا اور شہباز کی بیوی اس کی پسند کی نہیں۔ بات تو تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی ہوئی اور پھر اب جو بھی ہو۔ واپس پلٹنا ممکن کہاں۔ اس نے شہباز کے کھلتے ہوئے سانولے چہرے' کالی گھنی مونچھوں اور گہری چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ فلیٹ جو اس نے فقط مجھ سے ملنے کے لئے یہاں لے رکھا ہے اور اس میں رکھی ہوئی تمام چیزیں اور شہباز میرا ہے۔ صرف میرا۔ مجھے آس پاس سے کیا مطلب۔ مگر نجانے کیوں یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ نمکین پانی کے دو قطرے اس کی گالوں سے پھسل کر کانوں کی لوؤں میں جذب ہو گئے۔ اس نے اپنی بانہیں شہباز کے گلے میں ڈال دیں اور خود اس کے سینے سے لگ کر یوں لمبے لمبے سانس لینے لگی جیسے چلتے چلتے تھک گئی ہو۔ یہ عجیب سا بندھن تھا۔ اک خاموش ان کہا معاہدہ' نہ کوئی وعدہ نہ امید' نہ قول نہ قرار' نہ ملنے کا انتظار نہ بچھڑنے کی چنتا' نہ کوئی مادی غرض نہ دنیاوی مطالبہ' بس اک معمول کی طرح وہ ایک دوسرے سے ملتے۔ اک عادت سی ہو گئی تھی۔ انہیں اک دوسرے کو دیکھنے سننے اور قریب رہنے کی۔ پھر کوئی بھی الوداعی جملہ کہے بغیر وہ خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف پشت کر کے اپنی اپنی اصل پناہ گاہوں کی طرف لوٹ جاتے۔ یوں جیسے ایک دوجے کو جانتے ہی نہ ہوں۔

ہمسایوں کی مشکوک نگاہوں اور سرد رویئے کو اس نے شربت کی طرح گھونٹ گھونٹ پی لیا۔ رہا بچوں کا مسئلہ تو اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ دن کو ایک

جزو وقتی ملازمہ رکھ لی اور راتوں کی غیر حاضری میں وہ تھوڑی سی افیون دودھ میں حل کر کے بچوں کو پلا دیتی اور خود تالا لگا کر چلی جاتی۔

اس کی ایک اپنی دنیا تھی جس میں وہ آنکھیں بند کر کے رہ رہی تھی۔ ثمر تم کیسی بے غرض و بے نیاز عورت ہو۔ کس مٹی کی بنی ہو آخر۔ کوئی عورتوں والی عادت ہی نہیں تم میں۔ یار کچھ چاہا کرو۔ کوئی خواہش کوئی ضد۔ کوئی اصرار آخر کچھ تو ہو۔ شہباز اس جوگی صفت عورت سے شاید اندر ہی اندر خائف تھا۔ یا وہ واقعی حیرت زدہ تھا۔ اک ایسی حیرت جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس کی بات پر وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی خالی خالی آنکھیں پل بھر کو چمکیں۔ اس نے شہباز کے سانولے وجیہہ چہرے پر اک بھرپور نظر ڈالی اور ہاتھوں سے اپنے الجھے بال سنوارتے ہوئے ہولے سے بولی۔ یہ بات تم نہیں سمجھ سکو گے تم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ابھی تک اس راستے پر تمہارا پہلا قدم بھی نہیں اٹھا جس کی جوکھم میں صدیوں سے سہہ رہی ہوں۔ تم اس بے خواہش پنے کی لذت سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔ جس نے میرے پور پور میں گھر کر لیا ہے۔ میں بڑے مزے میں ہوں مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے شہباز چپ ہو گیا۔

شہباز کا فون آیا۔ حسب معمول شمو بلانے آئی۔ ثمر میں آ گیا ہوں۔ فورا" آ جاؤ۔ اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔ اس کی بات سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ کیوں کیا ہوا؟ شہباز دراصل آج صائمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں بہت رو رہی ہے۔ میں ______ نہیں آ سکوں گی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ اس کی بات سن کر تھوڑی دیر کے لئے دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس کی آواز ابھری۔ تھوڑی دیر کے لئے آ جاؤ پھر چلی جانا۔ نہیں میرے لئے آج آنا ممکن نہیں۔ اس نے قطعیت سے کہا۔ تو ٹھیک ہے اگر آج نہ آئیں تو پھر کبھی آنے کی ضرورت نہیں۔ شہباز کے الفاظ اس پر آگ کے گولوں کی طرح برس پڑے۔ وہ چند لمحے ریسیور ہاتھ میں پکڑے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اک گہری سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

یار آج وہ نظر نہیں آ رہی۔ کون؟ بھئی وہ تمہاری چڑیا جسے تم نے کیپ کر رکھا ہے۔ کہنے والے نے ایک آنکھ میچ کر خالص لوفرانہ انداز میں کہا۔ خدانخواستہ میرا مطلب ہے کسی اور نے تو نہیں اڑا لی؟ کیا بکتے ہو۔ شہباز نے برہمی سے کہا۔ ہمارے ہوتے ہوئے کسی کی کیا مجال جو اسے اڑا لے جائے۔ تو پھر آج اتنے تنہا کیوں ہو؟ کہنے والا تجسّس لہجے میں بولا۔ واہ تنہائی کی بھی خوب کہی۔ ارے میرے یار وہ مجھے تنہا رہنے کب دیتی ہے۔ آج تو اس کی بچی بیمار تھی اس لئے نہیں آ سکی۔ ورنہ ہم بلائیں اور وہ نہ آئے۔ وہ چہک کر بولا۔ پھر چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی پھر اس سکوت کو شہباز کی آواز نے درہم برہم کر دیا۔ ویسے حامد یار یہ "کیپ" والی بات کچھ جچی نہیں۔ ارے بھلے آدمی "کیپ" کے تو سو سو نخرے اٹھانے پڑتے ہیں۔ مطالبے ماننے پڑتے ہیں۔ جیب ہلکی کرنی پڑتی ہے۔ کیا مطلب؟ کہنے والا اب کے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ارے میرے یار سمجھا کر۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ نہ جیب پر بوجھ۔ نہ ذہن پر بھار۔ بس اک بارہ آنے کی ٹیلی فون کال اور کچھ بھی نہیں۔ وہ سر کے بل دوڑی چلی آتی ہے۔ ارے بھئی مجھے تو وہ صرف بارہ آنے میں پڑتی ہے۔ بارہ آنے میں۔ اس نے چہکتے ہوئے حامد کی طرف دیکھا جو خاصے گاؤدری پن سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے آگے کھڑی ثمر دیوار کو تھام نہ لیتی تو ضرور گر پڑتی۔ زمین اس کے قدموں کے نیچے شاید کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر خشک پتے کی طرح ڈول رہی تھی۔ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔ اب ___ اب ___ نشیمن کدھر ہو۔ **گھونسلہ** تو جل چکا۔ نجانے خود کو کس طرح گھسیٹتے ہوئے وہ بس اسٹاپ تک پہنچی۔ بس اسٹاپ خالی پڑا تھا۔ رات خاصی زیادہ ہو چکی تھی۔ خود فراموشی کے عالم میں بہت دیر تک وہ کھڑی رہی۔ بی بی کام چاہئے۔ دفعتاً" اک گھاگ آواز اور بے باک لہجہ اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ اس نے سر اوپر اٹھایا اور بولنے والے کی طرف دیکھا۔ اک بھرے نقوش اور گہری رنگت والا ادھیڑ عمر مرد اس کے قریب کھڑا بڑی گہری اور تولنے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہاں۔ اسے اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔ تو پھر آؤ۔ مرد نے سامنے کھڑی کھٹارا

سی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ کار کے قریب پہنچ کر اس نے دروازے کے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سنو۔ تم نے اپنا ریٹ تو بتایا ہی نہیں۔ مرد نے اک ننگی نظر اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میرا ریٹ۔ وہ رکی اک **استہزاء یہ** مسکراہٹ اس کے خشک لبوں پر جاگی اس نے مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ بارہ آنے ہے۔ پھر اس نے مرد کے حیرت زدہ چہرے کی طرف دیکھے بغیر کار کا دروازہ کھولا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مرد ابھی تک بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کار اسٹارٹ کر دی۔ شاید پاگل ہے بیچاری۔ اس نے اس کے الجھے ہوئے بالوں اور بے ترتیب حلیے پر نظر ڈالی۔ وہ ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے اندر بگولوں کی طرح اٹھنے والے سوالات کی بازگشت کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا۔ اب وہ جانتی تھی کہ وہ کون ہے۔ صرف اور صرف بارہ آنے کی عورت۔

درد کا رشتہ

سعیدہ گزدر

لیلیٰ نے سر اوپر اٹھایا۔ سامنے کونسل ہال کی عمارت پر کھدی تاریخی شبیہیں دھوپ میں چمک اٹھیں۔ بازار کے احاطے میں ہمیشہ کی طرح رولینڈ کھڑا تھا۔ "رولینڈ، بس رولینڈ ہے"۔ بریمین کے باشندوں میں کہاوت مشہور تھی۔ رولینڈ عوام کا نجات دہندہ تھا۔ اس کی بہادری اور بے جگری کے قصے اور گیت مغربی جرمنی کے اس چھوٹے سے خوبصورت شہر میں بہت مقبول تھے۔ روایت کے مطابق آج بھی رولینڈ کی سالگرہ پر یہاں عوام اسے شمپین کی بہترین بوتل پیش کر کے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

لیلیٰ کو یہاں آئے ہوئے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ اکثر شام میں اور ویک اینڈ پر وہ بریمین کے اس پرانے تاریخی علاقے میں ٹہلنے آ جاتی۔ یہاں کی تنگ پتلی گلیاں جو بھول بھلیوں کی طرح ہمیشہ بازار کے احاطے میں ختم ہو جاتیں۔ چھوٹے چھوٹے ریستوران، شراب خانے، صدیوں پرانے گرجے، ان کا تاریخی پس منظر اور ان کے اندر سے آتی ہوئی پرانی جرمن کلاسیکی موسیقی کی دھنیں اسے اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ اس چوک میں کلچر کی فراوانی اور بھیڑ بھاڑ اسے بہت پسند تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہلتی ہوئی بس اسٹینڈ کی طرف آ جاتی۔ یہاں بڑے بڑے کرینوں اور مشینوں پر مزدور اور انجینئر کام کرتے رہتے۔

"جس قوم میں اتنی تعمیری قوت ہو وہ کس طرح جنگ کے جنون میں مبتلا ہو گئی"۔ لیلیٰ سوچا کرتی۔

"جنگ کے باوجود یہ سب کس طرح بچ گیا؟"۔ اس نے پچھلے ہفتے ایک گائیڈ سے پوچھا تھا۔

"بڑی تباہی اور توڑ پھوڑ ہوئی لیکن ہم نے دوبارہ نئے سرے سے یہ

سب بنایا ہے۔ تاریخی عمارتوں کو اسی ڈھنگ سے سنوارا ہے۔" گائیڈ نے پرانے مجسموں اور دیواروں پر بنی شبیہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

لیلیٰ نے گھڑی دیکھی۔ ابھی چھ بجے تھے۔ ہاسٹل واپس جانے کے خیال سے اسے وحشت ہوئی۔ کمرے میں گھٹن اور تنہائی کا شدید احساس ہونے لگتا تھا۔ وہ بازار سے نکل کر بزیمین ہسپتال کی پرائیویٹ سڑک پر چلنے لگی۔ کوئی سائیکل سوار تیزی سے لہراتا ہوا قریب سے گزر جاتا۔ چند مریض ہسپتال کے کپڑوں پر ڈریسنگ گاؤن پہنے چہل قدمی کر رہے تھے۔ کچھ بنچوں پر بیٹھے موسم کی شگفتگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک ہیلی کاپٹر کے انجن کی گڑگڑاہٹ سے فضا گونج اٹھی اور چند لمحوں بعد دور ہسپتال کے میدان میں ایک ہیلی کاپٹر اتر گیا۔ کوئی ایمرجنسی تھی۔ لمحے بھر میں مریض کو اندر لے جایا گیا۔ لیلیٰ حسرت سے دیکھتی رہی۔ اس کے شہر میں نہ جانے کتنے لوگ ابتدائی طبی امداد نہ ملنے کے سبب سڑکوں پر ہی دم توڑ دیتے تھے۔

"کاش _____" شدت سے اس کا جی چاہا کسی سے باتیں کرے۔ کسی کو سب کچھ بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے کینی زبان نہ آنے کے سبب اس سنہری موسم میں تنہائی اور بے بسی کا احساس شدید ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال کر مٹھیاں بھینچ لیں۔ پت جھڑ شروع ہو چکے تھے۔ زرد مرجھائے پتوں کا قالین سا فٹ پاتھ _____ ہوتا تھا جس پر چلتے ہوئے ایک ملائم اور آرام دہ کیفیت کا احساس ہوتا۔ جیسے کراچی کے سمندر میں نرم ریت پر چلتے ہوئے ہوتا تھا جب اکتوبر، نومبر کی پرسکون، مہربان لہریں آہستہ آہستہ پیروں کی تھپکیاں دیتی تھیں _____ پیچھے بہت زور کی گھنٹی بجی۔ وہ اچھل کر پیدل چلنے والے راستے پر کھڑی ہو گئی۔ ایک بوڑھی عورت غصے میں کچھ کہتی ہوئی سائیکل پر گزر گئی۔ یہاں سائیکل چلانے اور پیدل چلنے والوں کے لئے الگ الگ فٹ پاتھ بنی ہوئی تھیں۔ لیلیٰ کا پاکستانی ذہن ابھی تک ان قاعدوں اور قوانین کا عادی نہیں ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا ان بوڑھی خاتون کو روک کر معذرت کرے مگر تب تک وہ دور جا چکی تھیں۔ سائیکل موڑ پر غائب ہو گئی۔ ایک زمانہ ہو گیا تھا اسے سائیکل چلائے ہوئے۔ وہ چھوٹی سی تھی تو گھر کے آس

پاس سنسان سڑکوں پر سائیکل چلاتی تھی لیکن ذرا بڑی ہوئی تو یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ پورے ماحول میں عورتوں کے لئے اتنی شدید ممانعت اور مخالفت بھری ہوئی تھی کہ وہ خود بخود ہی بہت سے کام کرنا چھوڑ دیتی تھیں۔ یہاں تک کہ اب تنہا چہل قدمی کرنے کا خیال بھی لیلیٰ کے دماغ میں نہیں آتا تھا اور یہاں بریمین میں ستر پچھتر برس کی عورتیں مزے سے سائیکل چلاتی تھیں۔ اچانک ایک بڑا سا کتا اسے دیکھ کر بھونکنے لگا۔

"کشتیہ ____ کشتیہ----" ایک بوڑھی نسوانی آواز نے کتے کو زور سے ڈانٹا۔ "معاف کرنا یہ بے وقوف تمہیں مختلف سمجھ کر بھونکنے لگا۔" جرمن عورت نے کتے کے گلے میں پٹہ ڈالتے ہوئے زنجیر تھام لی۔ لیلیٰ گردن ہلا کر مسکرا دی۔

"Sind Sie aus Indian?- کیا تم ہندوستانی ہو؟" جرمن خاتون نے پوچھا۔

"Nai ich bin Pakistani - نہیں میں پاکستانی ہوں۔" لیلیٰ نے جھجکتے ہوئے بڑی بے یقینی سے جواب دیا۔ اسے اپنی جرمن پر رتی برابر بھروسہ نہیں تھا۔ ہمیشہ کوئی لفظ یا جملہ بول کر سوچتی "کہیں میری بات غلط نہ سمجھی جائے"۔ لیکن اس وقت سر راہ کسی سے باتیں کرتے ہوئے بڑی تقویت محسوس ہوئی۔

تھوڑی دیر پہلے کی تنہائی اور اجنبیت ان چند لفظوں کی گرمی میں پگھل گئی۔

"Sprechen Sie Duetch? __ تم جرمن بولتی ہو؟"

"Nai leider Nicat - نہیں ذرا بھی نہیں۔" لیلیٰ جھینپ گئی۔

"سلام"۔ جرمن خاتون نے بہت صاف اردو میں کہا۔

"تمہیں ____ تم کو اردو آتی ہے"۔ لیلیٰ اچھل پڑی۔ حیرت کے مارے وہ اپنی آواز پر قابو نہ پا سکی۔

"بہت ذرا سی ____ اس سے بھی کم جتنی کہ تمہیں جرمن آتی ہے۔" جرمن خاتون نے بڑی رواں انگریزی میں جواب دیا۔

لیلیٰ نے مسرت سے ان خاتون کو دیکھا۔ یہاں نوجوان خاصی تعداد میں انگریزی بولتے تھے لیکن اس عمر کے جرمن مرد' عورتوں کے منہ سے اس نے ابھی تک انگریزی کا ایک لفظ نہیں سنا تھا۔ پاکستان میں لیلیٰ اور اس کے ساتھی برطانوی نو آبادیاتی حکمرانی کی چھوڑی ہوئی اس غلامانہ ذہنیت پر بہت کڑھتے تھے۔ جہاں انگلش میں بات کرنا ایک طبقے کی حکمرانی اور قوت کی علامت تھا۔ لیلیٰ اور اس کے ہم خیال کہتے تھے کہ اپنی زبان' کلچر اور تاریخ کو بھلا کر یا کمتر سمجھ کر ہم کبھی صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کا طریقہ تعلیم ابھی تک وہی تھا۔ لیلیٰ کی طرح سوچنے والے کہتے۔

"ہمیں دوری زبانیں خصوصاً" ترقی یافتہ زبانیں ضرور سیکھنا چاہئیں مگر معاشرہ کو تقسیم کرنے اور ایک چھوٹے سے طبقے کی حکمرانی کے لئے ہرگز نہیں۔"

بہرحال اس وقت ان جرمن خاتون کے منہ سے اتنی رواں انگریزی سن کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ کم از کم وہ ان سے باتیں کر سکتی تھی۔ جرمن خاتون کا پورا سر سفید تھا۔ وہ ستر برس سے اوپر لگ رہی ہوں گی۔ لیکن چہرے اور جسم سے خاصی چاق و چوبند لگتی تھیں۔ چشمے کے پیچھے ان کی سرمئی آنکھیں بشاشت سے مسکراتے ہوئے لیلیٰ کو دیکھ رہی تھیں۔

"پاکستان میں کس شہر کی رہنے والی ہو؟"

"کراچی کی۔"

"اوہ ___" ان کا چہرہ روشن ہو گیا۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی مہمان ہوں۔ آٹھ ہفتے کے زبان کے کورس پر آئی ہوں اور قریب ہی ہوسٹل میں رہتی ہوں۔" لیلیٰ نے اس جانب اشارہ کیا جہاں اس کا ہاسٹل تھا۔

"تم آٹھ ہفتے میں زبان سیکھ لو گی؟"

"نہیں بہت مشکل ہے۔" لیلیٰ نے صفائی سے جواب دیا۔

"لیکن تم اور بہت کچھ سیکھ سکتی ہو۔ دیکھ سکتی ہو۔" جرمن خاتون نے

اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس موقعہ سے تمہیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ میں فرا شیلر ہوں۔" انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"میں فرا علی ہوں لیکن میرا نام لیلیٰ ہے۔"

"اچھا لیلیٰ پھر ملاقات ہو گی۔" فرا شیلر کتے کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

سہ پہر میں جب بھی لیلیٰ باہر جاتی فرا شیلر اسے اپنے کتے کے ساتھ ٹہلتی ہوئی مل جاتیں۔ وہ ایک دوسرے سے مانوس ہو گئی تھیں۔ کشتیہ جو پہلے روز لیلیٰ کو دیکھ کر بھونکا تھا اب گرمجوشی سے دم ہلانے لگتا۔ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود لیلیٰ کو سہ پہر کا انتظار رہتا کب فرا شیلر سے ملاقات ہو گی۔ ایک بے نام سا رشتہ قائم ہو گیا تھا ان کے درمیان۔ "ہمارے یہاں کہتے ہیں کہ جب موسم ایسا ہو تو سمجھ کہ جرمنی کی زمین پر فرشتے چل رہے ہیں۔" ____ فرا شیلر نے ایک روز اسے بتایا تھا۔ موسم جرمنی کے حساب سے واقعی بہت عمدہ تھا۔ ستمبر کے آخری دن تھے۔ لیلیٰ سارا دن دھوپ سیکتی رہتی تھی۔

اس روز صبح بارش ہوئی تھی لیکن سہ پہر میں مطلع صاف تھا۔ لیلیٰ ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ اچانک بادل گھر آئے۔ ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ تیز بارش ہونے لگی۔ لیلیٰ کے پاس چھتری نہیں تھی وہ ایک مکان کی برساتی میں کھڑی ہو کر بارش ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ کھڑکی کے شیشے پر کسی نے دستک دی۔ لیلیٰ ڈر گئی۔ شائد کوئی اسے وہاں کھڑا ہونے سے منع کر رہا تھا۔ مگر دوسرے لمحے فرا شیلر کا مہربان چہرہ شیشے کے پیچھے مسکرا رہا تھا۔

"کیا تم اندر آنا پسند کرو گی؟" ____ وہ بارش کے شور میں چیخ کر پوچھ رہی تھیں۔ لیلیٰ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اس تمام عرصے میں کسی نے بھی اسے اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جرمن لیتے دیتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی تو بالکل نہیں گھلتے ملتے۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں"۔ اس نے فرا شیلر سے بھی زیادہ اونچی اور جوشیلی

آواز میں جواب دیا۔

"تم تو بالکل بھیگ گئی ہو۔ آؤ یہاں ہیٹر کے پاس بیٹھ جاؤ۔" فرا شیلر نے محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

"آپ کا صوفہ خراب ہو جائے گا۔"

"بے کار باتیں نہیں کرو۔" فرا شیلر نے ناراضگی سے کہا۔ "میں کافی لاتی ہوں۔ اتنی دیر تم سکون سے بیٹھو"۔ وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

لیلیٰ بڑے سے چمڑے کے صوفے میں دھنس گئی۔ یہ پہلا جرمن گھر تھا جو اس نے اندر سے دیکھا تھا۔ بہت صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر، آتش دان اور کمرے کے کونوں میں ہر جگہ پھولوں سے بھرے گلدان اور سبز کروٹن والے گملے رکھے تھے۔ اس ماحول میں ایک مخصوص گھریلو گرمی اور اپنائیت تھی۔ فرش پر بہت پرانا قالین بچھا تھا۔ ایک طرف ریکارڈ پلیئر اور ٹیپ ریکارڈر کی شیلف تھی۔ ہر چیز میں ایک خاص ترتیب تھی۔

"معلوم ہوتا ہے یہ خاتون تنہا رہتی ہیں۔ شوہر مر چکے ہوں گے اور جب زیادہ بوڑھی ہوں گی تو بچے کسی اولڈ ہاؤس میں چھوڑ آئیں گے"۔ لیلیٰ کو اپنا گھر یاد آیا جہاں اس کا بچپن دادا، دادی، پھوپھی اور چچاؤں کے ساتھ گزرا تھا۔

کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ لیلیٰ نے لیمپ جلا دیا۔ اچانک لیمپ کے پیچھے کی دیوار جاگ اٹھی۔ موہن جوداڑو کے مہاپرونٹ کا بڑا سا مجسمہ جس کی سفیدی وقت کے باعث پیلی پڑ چکی تھی سامنے رکھا تھا۔ ایک ہاتھ کمر پر رکھے موہن جوداڑو کی رقاصہ انگڑائی لے رہی تھی۔ بڑے سے فریم میں بہت سی مہریں جڑی ہوئی تھیں۔ انجانی زبان میں لکھی شاعری اور ہندسے، جانوروں کی تصویریں اور زندگی کی مختلف کیفیتیں۔ ان سب کے نیچے ایک تصویر ـــــ بہت پرانی تصویر! نوجوان پچیس چھبیس برس کا لگ رہا ہو گا۔ سنجیدہ اور بہت مخلص چہرہ تھا اور اس کے ساتھ بیس اکیس برس کی ایک لڑکی ـــــ مگر یہ نوجوان تو اپنی طرف کا لگتا ہے اور یہ لڑکی یقیناً فرا شیلر ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی بیٹی یا نواسی ہو ـــــ لیکن تصویر بہت پرانی

ہے۔ لیلیٰ غور سے تصویر دیکھ رہی تھی۔ پس منظر میں موہن جوداڑو کے کھنڈر تھے۔

"پچاس برس نہیں تو اڑتالیس برس پرانی ہے یہ تصویر ____ اس وقت کی بات ہے جب پاکستان نہیں بنا تھا۔" فراشیلر یہ میز پر کافی کی ٹرے رکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں ہاں لیلیٰ کا خاندان بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی آیا تھا۔ وہ خود پاکستان میں پیدا ہوئی تھی۔ "تم مجھے کارین کہہ سکتی ہو۔ فراشیلر میں کچھ تکلف سا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ آج آپ کو بہت تکلیف ہوئی۔ میری وجہ سے"۔

"یہ واجد ہے ____ اور یہ واجد کا کتا کشتیہ' کشتیہ فارسی نام ہے۔" کارین نے تصویر میں واجد کے پیروں کے پاس کھڑے کتے کی طرف اشارہ کیا۔ "جس زمانے میں تمہارے ہاں انگریز حکومت کے خلاف آزادی کی تحریک چل رہی تھی واجد کے خاندان کو عرصہ تک افغانستان میں جلاوطن رہنا پڑا تھا۔ وہ فارسی بہت عمدہ بولتا تھا۔" ____ کارین کی آواز کانپ رہی تھی۔ "میں اسی لئے اپنے ہر کتے کو کشتیہ پکارتی ہوں۔"

"کارین تم نے اس دیوار پر ہمارا موہن جوداڑو بسا رکھا ہے۔ کب گئی تھیں؟" لیلیٰ نے کافی پیتے ہوئے پوچھا۔

کارین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سفید سر آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ بالوں سے چھنتی روشنی میں اس کا چہرہ بے حد شفاف اور معصوم نظر آ رہا تھا۔ جیسے تصویر میں سے نکل کر پچاس برس پہلے کی کارین اس کے سامنے بیٹھی ہو۔ لیلیٰ محویت سے دیکھتی رہی ____ "وہ تم ہو؟" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"کتنی پرانی بات ہے ____ بہت پرانی ____" کارین نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔ وہ گہری دھند میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ____ جیسے سینما کے دھندلے سرمئی اسکرین پر تصویریں واضح اور روشن ہو جائیں۔ چہروں کی پہچان ہو جائے۔ آوازیں سنائی دینے لگیں۔

وہ برلن یونیورسٹی میں تاریخ اور آثار قدیمہ کی ہونہار طالب علم تھی۔

اپنے پروفیسر کے مشورے پر اس نے فیصلہ کیا کہ ایشیا کے آثار قدیمہ اور تاریخ پر کام کرے گی۔ ہندوستان کارین کی پہلی منزل تھا۔ کئی ہفتوں کے بعد جہاز کراچی کی بندرگاہ پر رکا تو کارین اور اس کے ہمسفر عرشے پر کھڑے ہو کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ ابھی بہت سویرا تھا۔ آسمان پر ایک دو ستارے صبح کی سفیدی مائل نیلی روشنی کو سلام کر رہے تھے۔ ہوا میں نومبر کی ہلکی سی خنکی تھی۔ کارین نے شال لپیٹ لی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ مشرق آئی تھی۔

"کسی نئی جگہ یا نئے شہر میں وہاں کی روایتوں اور قدروں کا احترام کرو۔ تب ہی تم کچھ سیکھ سکتی ہو۔ وہاں کے باشندوں کا اعتماد حاصل کر سکتی ہو۔" رخصت کرتے ہوئے اس کے والد نے سمجھایا تھا۔ وہ نصیحتیں نہیں کرتے تھے ہاں کبھی کبھی چند ایسے لفظ کہہ دیتے۔ برلن یونیورسٹی میں تاریخ اور آثار قدیمہ کے مانے ہوئے پروفیسر اور محقق تھے ان کی کئی چیزیں چھپ چکی تھیں۔ سفید بگلوں کا ایک جھنڈ اڑتا ہوا کارین کے سر پر سے گزر گیا۔

"یہاں کی مقامی روایت کے مطابق کسی کے سر پر سے بگلہ اڑتا گزر جائے تو اس شخص کی تلاش یا آرزو ضرور پوری ہوتی ہے۔" جہاز پر کام کرنے والے ایک انگریز انجینئر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کارین میں بہت دلچسپی لینے لگا تھا۔

"میرے سر پر سے تو پورا جھنڈ اڑا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ پورا ہو جائے گا۔" کارین نے خوش دلی سے جواب دیا۔

نیلے خاموش پانی پر کہیں کہیں جہاز کھڑے تھے۔ اب ماحول میں کچھ ہلچل پیدا ہو رہی تھی۔ مچھیرے چپوؤں سے چھینٹے اڑاتے کھلے سمندر کی طرف سے کنارے پر آ رہے تھے۔ چند بادبانی کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ ساحل پر بنے پروٹسٹ چرچ کی گھنٹیاں وقفے سے بج رہی تھیں۔ قریب ہی کہیں مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔ کارین نے پہلی مرتبہ اذان سنی تھی وہ کان لگا کر غور سے سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دور سے ایک مندر کے کلس چمک اٹھے۔ بچے مندر کے سمندری گھاٹ میں نہا رہے تھے۔ عورتیں دھیمے سروں میں بھجن گا رہی تھیں۔ "اوم ______ شانتی

_______ شانتی _____ شانتی"۔ تھالیوں میں پوجا کے پھول سجا رہی تھیں۔ مرد لکڑی کی کھڑاویں پہنے سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ نہا رہے تھے' پوجا کے لئے مندر میں جا رہے تھے _____ چند منٹوں میں کارین نے زندگی اور معاشرے کے اتنے رخ دیکھ لئے۔ جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گھوڑے گاڑی میں سامان رکھواتے ہوئے' قلیوں کو پیسے دیتے ہوئے بار بار کارین کے ذہن میں ایک خیال اٹک جاتا۔ "میں یہاں جس تلاش میں آئی ہوں وہ پوری ہو گی؟ ___ پوری ہو گی؟ ____ پوری ہو گی؟----" وہ کھو سی جاتی۔

جمعدار بڑی بڑی جھاڑوئیں تھامے سڑکیں دھو رہے تھے۔ پہلی بارش پڑنے کے بعد سوکھی زمین سے اٹھنے والا سوندھا پن فضا میں رچا ہوا تھا۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ اور کسٹمز کی بڑی سی پتھر کی عمارت پر

"Oh Lord .... peace ...... peace .... peace"

یونین جیک لہرا رہا تھا۔ ہائی کورٹ کے احاطے میں سے گزرتے ہوئے کارین نے گھوڑا گاڑی رکوا دی۔ سرخ پتھر کی عمارت شاندار راجستانی طرز تعمیر کا نمونہ بنی سامنے کھڑی تھی۔ کارین سانس روکے دیکھتی رہی۔ ایسی عمارتیں اس نے صرف کتابوں میں دیکھی تھیں _____ ایک سینما ہال کی دیوار پر بڑے سے پوسٹر میں کسی خوبصورت رقاصہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ لمبے قد اور تیکھے نقوش والے مہذب مرد اور عورتیں دھیمی آواز میں باتیں کرتے گزر رہے تھے۔ سودا خرید رہے تھے۔ دفتروں کو جا رہے تھے یوں ہی ٹہل رہے تھے۔ تقریبا" ہر عورت کے بالوں میں سفید بیلے چمبیلی کے گجرے لپٹے ہوئے تھے۔ کارین جس ہوٹل میں ٹھہری تھی وہاں کا مالی ہر صبح اس کے لئے ہاتھوں' گلے اور سر کے لئے پھولوں کے گہنے بنا کر دے جاتا۔

"تم نے پہلے روز کہا تھا کہ تم کراچی کی رہنے والی ہو" _______ کارین نے لیلیٰ سے پوچھا۔

"جی"۔

"مجھے بتاؤ اب وہ شہر کیسا ہے؟ کیا اب بھی تم لوگ گجرے بالوں میں

لپیٹ کر گھومتی ہو؟ کیا سڑکیں اب بھی صبح سویرے دھوئی جاتی ہیں؟ لوگ مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں؟"۔

"وہ کراچی؟ _______ نہیں اب تم اسے نہیں پہچان سکتیں"۔ لیلیٰ نے جواب دیا۔

وہ سڑکیں ______ لیلیٰ کو دھواں دھواں سڑکیں یاد آ گئیں۔ ٹریفک کے قاتلانہ شور' تیز رفتاری اور زہریلی آلودگی میں وہ پلی بڑی تھی۔ انہی سڑکوں پر سے گزر کر اسکول' کالج گئی تھی۔ دھکے کھائے تھے۔ حقارت آمیز رویئے برداشت کئے تھے۔ غصہ' جھنجھلاہٹ اور بے بسی میں اپنے آپ کو عورت پیدا ہونے پر کوسا تھا۔ عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں' ان کے انسانی درجہ کو ختم کرنے کے لئے بنائے جانے والے نئے نئے قوانین اور انہیں مذہبی رنگ دے کر مقدس ظاہر کرنے کی ملاؤں کی سازش کے خلاف احتجاجی مظاہروں اور جلسوں میں شریک ہوئی تھی۔ پولیس سے ہاتھا پائی کی تھی۔ اس کے کتنے ساتھی جیل گئے تھے۔ اپنے شہری اور انسانی حقوق مانگنے کے الزام میں انہوں نے کتنی راتیں تھانوں میں گزاری تھیں۔

"نہیں اب بالوں میں گجرے لپیٹ کر سڑکوں پر گھومنا تقریباً" ناممکن ہے "۔ لیلیٰ نے پھیکی آواز میں کہا۔

کراچی' ٹھٹھہ' چوکھنڈی اور بھنبھور کے بعد کارین موہن جوداڑو پہنچی۔ اس زمانے میں وہاں ہوائی جہاز نہیں جاتے تھے۔ ریل کا سفر بہت لمبا اور پیچیدہ تھا۔ کارین دو روز کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچی تو تھکن سے نڈھال تھی۔

"آپ نے بہت مشکل پراجیکٹ لیا ہے" _____ موہن جوداڑو میوزیم کے نوجوان انچارج واجد نے دبلی پتلی کارین کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کارین نے گردن اٹھا کر سوالیہ نظروں سے واجد کو دیکھا۔ اس کی سانولی رنگت' گھنے سیاہ بال' لمبے قد اور بولنے کے پرخلوص انداز میں ایک انجانی دلکشی تھی۔ ایسی کشش جو کارین نے آج تک کبھی کسی کے لئے محسوس نہیں کی تھی۔ بمبئی یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد واجد کچھ عرصہ بطور اسسٹنٹ پروفیسر

کے وہاں پڑھاتا رہا پھر اس کے دماغ میں نہ جانے کیا سمایا کہ بمبئی یونیورسٹی جیسی ترقی کرنے والی جگہ کو چھوڑ کر اس قدیم اور خاموش کھنڈر میں آ بسا۔ "یہ ملک اتنا قدیم' اس قدر پر اسرار اور بڑا ہے "کہ ــــــــ؟"

"مجھے اندیشہ ہے تم پھنس کر رہ جاؤ گی۔" پھر کارین کا اترا چہرہ دیکھ کر جلدی سے بولا "نہیں میں حوصلہ شکنی نہیں کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرا اندیشہ بالکل بے بنیاد ہو۔ بس یہ منصوبہ مجھے کچھ رومینٹک لگا"۔

"رومینٹک ہوں میں۔ لیکن ساتھ ہی اپنے ارادے میں کافی مضبوط"۔

کارین نے کھڑکی کے باہر کھنڈروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "دراصل جستجو کی تربیت مجھے ورثے میں ملی ہے۔"

"تب یہ خواب نہیں ہے"۔

"خواب ہو سکتا ہے لیکن جھوٹا اور بے معنی نہیں"۔

"یہ بھیل قبیلے کا آدمی ہے"۔ واجد نے میوزیم کے لان میں کام کرتے ہوئے مالی کی طرف اشارہ کیا۔ "بھیل قبیلہ موہن جوداڑو کے آس پاس دیہاتوں میں رہتا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہی لوگ اس قدیم شہر کے باشندے ہیں۔"

بھیل قبیلے کی عورتوں کو دیکھ کر بار بار کارین کو رقاصہ کی صورت یاد آ جاتی۔ جو مہاپروہت کے سامنے رقص کرتے ہوئے بڑی شان سے کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ عورتیں مردوں کے ساتھ ساتھ کام کرتی تھیں۔ ان کے کسے ہوئے سانولے جسم' سیاہ بالوں کے جوڑے شوخ چمکتے رنگوں کا گھاگھرے اور چنریاں' کلائیوں میں رنگ برنگی چوڑیاں سب کچھ پانچ ہزار برس پرانی تصویروں میں سے نکل کر حال میں سانس لے رہا تھا۔ حال اور اتنے پرانے ماضی کی اس مماثلت پر کارین چکرا گئی۔ ان لوگوں میں سارا دن گزار کر واپس آئی تو سیدھی موہن جوداڑو کے کھنڈروں میں چلی گئی۔

"کیا یہ لڑکی تھکتی نہیں"۔ واجد نے سوچا۔

"میں حال کے تاثرات کو ماضی میں پڑھنا چاہتی ہوں"۔ کارین نے واجد

کی سوچ کو تاڑ لیا تھا۔

ڈوبتے سورج کی کمزور نارنجی روشنی میں اس کے گھنے بھورے بالوں میں شعلے سے لپک رہے تھے۔ شعاعوں کے کھیل نے چھوٹے سے زرد چہرے کو بہت حسین بنا دیا تھا۔ اس ماحول' اس زمین اور ماضی کی ان شاندار بنیادوں کو جن پر وہ کھڑی تھی نظروں ہی نظروں میں پی جانا چاہتی تھی۔

"یہاں آنے سے پہلے مجھے بہت خوفزدہ کیا گیا۔ اس حد تک کہ میں نے اپنا ارادہ تقریباً" ترک ہی کر دیا تھا" ______ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ " لوگ عجیب عجیب باتیں کرتے تھے۔ جیسے کہ میں آدم خوروں کے ملک میں جا رہی ہوں۔ مگر والد نے میری بہت ہمت بڑھائی۔ انہوں نے کہا کہ شک و شبہ اور لاعلمی کی بنیاد پر بنائے مفروضات ہمیشہ جہالت' تنگ نظری اور تباہی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ ان کے کئی طالب علم تمہارے یہاں کی یونیورسٹیوں میں پڑھا رہے ہیں۔ مجھے ہی دیکھو کتنا کم وقت ہوا ہے اور تم جیسے مہربان دوست مل گئے"۔ کارین نے بڑے جذبے سے کہا۔

"کارین"۔ واجد نے آہستہ سے پکارا۔ گلی تنگ تھی وہ ہٹ کر ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔

"کیا میں تمہارا وقت ضائع کر رہی ہوں؟" کارین نے پوچھا۔

"میں کبھی کبھی فلاحی کام بھی کر لیتا ہوں"۔ واجد مسکرا دیا۔

" مثلاً" آج کل مجھے پانچ ہزار برس پرانی تہذیب پڑھا رہے ہو"۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم حقیقت کے اس قدر قریب آئی ہو تو اسے دیکھو' چھو کر محسوس کرو۔ کتابوں میں نہ الجھو"۔ واجد نے اینٹوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ کہیں کہیں سے سرخ مٹی جھڑ گئی۔ "انسانی تہذیب کی کتنی تہیں دفن ہیں یہاں جو سندھ کے کنارے کنارے بہت دور مشرق وسطیٰ تک پہنچ گئی تھی۔"

کارین کی آنکھیں بند تھیں۔ گلیوں میں لڑکیاں دوڑ بھاگ رہی تھیں۔ ان کے پیروں میں بندھے گھنگھرو اور کلائیوں کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ بازار میں تجارت ہو رہی تھی۔ بیچ سڑک پر بیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان پر اناج اور دوسرا

سامان لادا جا رہا تھا۔ شہر کے عقلمند اور پڑھے لکھے لوگ زندگی کی پیچیدہ گتھیاں سلجھا رہے تھے۔ دریا کے کنارے جہاز سامان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ یہ سامان بابل اور نینوا کو جانے والا تھا۔

"لیکن یہی دریا اس شہر کی تباہی کا سبب بنا"۔ کارین نے آنکھیں کھول کر واجد کو دیکھا۔ وہ بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جیسے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"یہ تہذیب کئی مرتبہ اجڑی ہے اور کھدائی کے وقت پتہ چلا کہ سب سے نچلی تہ تمدن کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ پھر یہ کہ دریا کے علاوہ تباہی کی کئی وجوہات ہیں۔ کچھ ماہروں کا خیال ہے کہ اینٹیں پکانے کے لئے ان لوگوں نے تمام جنگل کاٹ دیئے۔ درخت نہ ہونے کے باعث بارش نہیں ہوتی تھی اور یہاں سخت قحط پڑا۔ دوسرے یہ کہ باہر سے حملہ آور آئے اور شہر کو نیست و نابود کر دیا۔ موہن جوداڑو کے معاشرے میں جنگ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جانتی ہو کسی بھی تہہ کی کھدائی میں ایک بھی ہتھیار نہیں نکلا۔ کس قدر امن پسند تھے یہ لوگ کہ اپنا دفاع بھی کرنا نہیں جانتے تھے۔" واجد جتنی دیر بولتا رہا کارین خاموش کچھ سوچتی رہی۔

"دریا یہاں سے کتنی دور ہے؟ کیا میں وہاں جا سکتی ہوں؟" اس نے بے صبری سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ لیکن وہاں تنہا جانا مناسب نہیں۔"

"کیا تم نہیں چلو گے؟"۔ کارین نے اس طرح پوچھا جیسے اس کے ذہن میں یہ بات پہلے سے طے تھی کہ واجد ہر جگہ اس کے ساتھ جائے گا۔

وہ دونوں نیچی چھتوں والے گھروں اور دیواروں کے نیچے چل رہے تھے۔ ان کے پیروں کی چاپ اس ویرانے میں کسی گزرتے ہوئے قافلے کی مانند پرشور تھی۔

"کارین ______ کارین ____ کارین میں تمہیں چاہتا ہوں ______ کارین"۔ صحرائی ہوا تھی۔ نہیں کوئی سرگوشی کر رہا تھا۔ کارین رک گئی۔ واجد خاموش، سنجیدہ اور بے حد پروقار اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"کارین _____" کوئی صدیوں پیچھے سے آواز دے رہا تھا۔
"واجد کیا تم کچھ کہہ رہے تھے"۔
"نہیں تو"
"واجد"
"کیا بات ہے کارین؟" ____ ماضی، حال، مستقبل اور پوری کائنات کی محبت ان چار لفظوں میں سمٹ آئی تھی۔

وہ گلیوں اور مکانوں میں سے گزرتے ہوئے اس بڑے سے تالاب کی سیڑھیوں پر رک گئے جسے پبلک باتھ کہتے ہیں۔ سیڑھیوں کی اینٹیں کئی جگہ سے ٹوٹ گئی تھیں۔ دور سے بانسری کی مدھم آواز آ رہی تھی۔

"اگر میں رقاصہ ہوتی اور تم پروہت _____"
"ہرگز نہیں" _____ واجد نے فوراً کارین کی بات کاٹ دی۔ "ہرگز نہیں میں ہر جگہ اور دیوار میں تمہارا ہم رقص ہونا ہی پسند کروں گا۔ تمہارا مالک نہیں"۔ وہ مسکرا دی۔

"کارین" واجد نے رقص کے انداز میں کارین کو تھام لیا۔
"ہاں" _____ کارین نے زیر لب جواب دیا۔
بانسری کی مدھر تان اب قریب آ گئی تھی۔ کوئی شاہ لطیف کی دھن بجا رہا تھا۔

وہی تو آرزوئے جسم و جاں ہے
وہ تو آبروئے امتحاں ہے
کہاں ہے میرا پردیسی کہاں ہے
بڑی مشکل میں جان ناتواں ہے
یہاں زاد سفر کا ذکر کیسا
نظر میں کائنات بے کراں ہے

بانسری کے لے پر واجد، کارین کو بہت نرمی اور پیار سے تھامے ہلکے ہلکے

رقص کرتا رہا۔ کارین کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

"آؤ واپس چلیں۔ اندھیرا بڑھ گیا ہے"۔ واجد نے اسے تھامے ہوئے کہا۔

"نہیں اسٹوپا کی طرف چلتے ہیں"۔ کارین آگے بڑھ گئی۔

دور دور تک سرخی مائل خشک مٹی پر سنسان اندھیرا کروٹ لے رہا تھا۔ کسی پہاڑی کے پیچھے چھوٹا سا جانور دوڑتا ہوا غائب ہو جاتا۔ دور گاؤں کے کچے گھروں اور جھونپڑوں میں چراغ جل بجھ رہے تھے۔

"کارین ______ کارین ______" زمین آسمان' مٹی کے ڈھیر' اسٹوپا کی سیڑھیوں' گاؤں کی روشنیوں اور ان سے بہت دور بہتے سندھو سے موسیقی کے تار جھنجھنا اٹھے تھے۔ "کارین ______ کارین ____"

"میں کیا کروں؟" ______ کارین نے بڑی بے بسی سے سر جھکا کر پوچھا۔

واجد نے نرمی سے کارین کے گھنے بھورے بالوں سے ڈھکے خوبصورت سر کو چوم لیا۔

"وہی تو آرزوئے جسم و جاں ہے ___" نیچے سڑک پر کسی نے بانسری کی دھن پھر سے چھیڑ دی۔ واجد نے کارین کو کاندھوں سے تھام لیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

ابھی آسمان تاروں سے ڈھکا ہوا تھا اور چڑیوں نے گانا نہیں شروع کیا تھا جب وہ دریا کے سفر پر نکلے۔ بیل گاڑی پر گھاس پھونس کی چھت تھی۔ ٹھنڈ کے باعث کارین نے بڑی سی سیاہ چادر لپیٹ لی تھی۔ وہ ابھی ابھی گہری نیند سے اٹھی تھی اور اس کی آنکھیں بوجھل تھیں۔ چادر میں لپٹا چھوٹا سا چہرہ بے حد معصوم لگ رہا تھا۔ واجد اسے پیار سے دیکھتا رہا۔ پھر دھیمی آواز میں بیل گاڑی والے سے باتیں کرنے لگا۔ کچی سڑک پر کسان اپنے بیلوں کو ہانکتے گزر رہے تھے۔ جانوروں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی رم جھم میں کسی نے گانا شروع کر دیا۔

جو اس ساگر کی سیوا کو نہ جائے
اسے کیونکر محبت راس آئے

آواز قریب آتی گئی۔ کارین نے آنکھیں کھول کر باہر دیکھا۔

جلائے جو بھی آشاؤں کے دیپک
وہی ساجن کو سینے سے لگائے

وہی ساجن کو سینے سے لگائے ______ وہی ساجن کو سینے سے لگائے _____" کیسا پرستش بھرا انتظار تھا اس گیت میں کہ بول نہ سمجھتے ہوئے بھی کارین نے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ "کارین _____" واجد اسے صدیوں پرانی چاہت سے دیکھ رہا تھا۔ "آؤ____" اسے گاڑی سے اترنے کے لئے سہارا دینے کو اس نے ہاتھ بڑھایا۔

صبح کی ہلکی گلابی روشنی میں مچھلی پکڑنے کے درجنوں جال پھیلے سوکھ رہے تھے۔ ننگ دھڑنگ بچے پالتو بھیڑوں اور بکریوں کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ پھر ہنستے، کھلکھلاتے پانی میں چھپ چھپ کرنے لگتے۔ کچھ عورتیں دریا کے کنارے بیٹھی برتن صاف کر رہی تھیں اور کچھ ایک جال پھیلائے اس کی مرمت کر رہی تھیں اور دھیمی آواز میں گا رہی تھیں۔ مرد مچھلیاں پکڑنے دور گئے ہوئے تھے۔

کبھی تو لوٹ کر آئے گا وہ پیارا
ہوا ہو جائے گا دکھ درد سارا
اسی امید پر اب جی رہی ہوں
یہی امید ہے میرا سہارا

یہی امید ہے میرا سہارا ________ یہی امید ____" کارین اور واجد کو دیکھ کر وہ عورتیں خاموش ہو گئیں۔

"یہ خاموش کیوں ہو گئیں۔ اتنا اچھا معلوم ہو رہا تھا" کارین نے مایوسی سے پوچھا۔

"گاؤں کے لوگ اجنبیوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ لوگ تو

ساری دنیا سے کٹے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی ان کی دنیا' ان کا خدا سب کچھ یہ پانی اور اس میں رہنے والی مچھلیاں ہیں" واجد نے سمجھایا۔

"لیکن دیکھنا ذرا دیر میں یہ ہمیں اپنا لیں گے۔ تھوڑی سی محبت اور احترام چاہئے ان کا دل جیتنے کے لئے"۔

"اور یہ رہتے کس طرح ہیں؟" _____ کارین نے حیرت سے پوچھا۔

"اس قبیلے کو میر بحر کہتے ہیں۔ یعنی پانی پر حکمرانی کرنے والے۔ صدیوں سے یہ اسی طرح ان کشتیوں میں رہتے آ رہے ہیں۔" واجد نے کشتیوں کی لمبی قطار کی طرف اشارہ کیا۔ قبیلے کے سردار کی کشتی سب سے بڑی' شاندار اور رنگ برنگی جھنڈیوں سے بجی ہوئی تھی۔ "یہ ان میں ہی پیدا ہوتے ہیں اور یہی ان کی کل گرہستی ہے" عورتوں نے برتن مانجھ لئے تھے۔ صاف ستھرے برتن دھوپ میں چمک رہے تھے۔

"مگر یہ رہتے کس چیز پر ہیں؟" ____ کارین نے جھنجلا کر پوچھا۔

"اپنے ہر کام' محنت اور مچھلیوں کا معاوضہ یہ چیزوں کی صورت میں لیتے ہیں۔ ایک طرح کا بارٹر سسٹم کہہ لو۔"

میر بحر لوگوں نے واجد اور کارین کو کشتی میں دریا کی سیر کرائی۔ مچھلی اور چاول کی روٹی سے ان کی خاطر کی۔ سارا دن ان دونوں نے مچھیروں کے گیتوں کے بیچ ایک دوسرے سے وعدے کرتے' ہنستے مسکراتے ______ محبت میں سرشار جھومتے گزار دیا۔

"تم کل چلی جاؤ گی؟" _____ واجد نے بڑی دیر بعد پوچھا۔ بیل گاڑی کے پہیوں میں سے نکلتی چرخ چوں خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ آج آسمان پر تارے بہت کم تھے اور باہر گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ گاڑی بان نے لالٹین جلا کر ایک بانس پر لٹکا دی۔

"لگتا ہے بارش ہو جائے گی"۔ اس نے اندر کی طرف منہ کر کے کہا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ کارین زبان نہیں سمجھتی تھی اور واجد نے جواب دینے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔ "تم کل چلی جاؤ گی؟" اس نے اپنی بات دہرائی۔

"ہاں مجھے اب جانا چاہئے"۔ کارین نے اس طرح جواب دیا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔ "چار روز کے لئے آئی تھی اور پندرہ دن ہو گئے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا"۔

"کیا کہا تھا میں نے؟"۔

"یہی کہ _______ کہ میں پھنس جاؤں گی یہاں"۔

"لیکن پھنس تو میں گیا ہوں"۔ واجد نے شرارت سے کہا۔ "لیکن دیکھو ہر جگہ یہ حرکت نہیں کرنا"۔ کارین مسکرا دی۔

"کیا تم میرے ساتھ ہڑپہ نہیں چل سکتے؟"

"ایسا ممکن ہوتا تو تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آخر تم کیوں نہیں رک جاتیں؟"

"رہی جانے کی ان کو اتنی جلدی
کہ وہ دو چار دن بھی رہ نہ پائے
بہت دن ہو گئے مجھ کو ترستے
میرے ساجن مگر اب تک نہ آئے

میرے ساجن مگر اب تک نہ آئے _____ کوئی قریب سے گاتا ہوا گزرا۔ واجد نے سر باہر نکال کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ کارین نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔ درد کی ٹیس پورے جسم میں سسک کر رہ گئی۔

میں ان کی یاد میں بیکل ہوں ایسی
کوئی برچھی سے جیسے چھید جائے
سدا اس پار ہی رہنا ہے جن کو
کوئی ایسوں سے کیسے لو لگائے

کوئی ایسیوں سے کیسے لو لگائے ______"

"میں نے ہڑپہ، ٹیکسلا ہر جگہ انتظام کر دیا ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں

ہو گی۔ لیکن کہیں اور وقت سے زیادہ نہیں رکنا ____ " واجد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میرا انتظار کرنا _____ بھولو گی تو نہیں ______ "

"دہلی میں میں تمہارا انتظار کروں گی۔ بھولو گے تو نہیں"۔ کارین نے اس کا دایاں ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے دل پر رکھ لیا۔ اندھیرے میں واجد اس کے آنسو نہیں دیکھ سکا۔

انہوں نے اسی طرح پروگرام بنایا تھا۔ پندرہ روز بعد کارین دہلی پہنچ جائے گی۔ اس دوران واجد اپنے کام ختم کر کے موہن جوداڑو سے سیدھا دہلی پہنچے گا اور دونوں ساتھ تاج دیکھنے جائیں گے۔ تب تک چاندنی راتیں شروع ہو جائیں گی۔

ٹیکسلا میں نیلے آسمان تلے کارین بدھ کے سکھائے اصولوں پر آنکھیں بند کئے گندھارا تہذیب کے دن رات اپنے دماغ' دل اور اپنے خیالوں میں دیکھتی رہی۔ بدھ کے کتنے روپ تھے۔ کتنے آسن اور کتنے موڈ۔ یہ سب کے سب مجسمہ سازوں کی اپنی خواہشوں' آرزوؤں اور محبت کا اظہار تھے جو بدھ کی تعلیم نے ان کے سینوں میں روشن کی تھی۔ یونیورسٹی کی سیڑھیوں پر وہ پتھروں کو ہاتھ میں تھامے سوچتی رہی۔ طالب علموں کی ٹولی الاپ کرتی سامنے سے گزر گئی۔ "اوم ______ شانتی ______ شانتی ____ شانتی ____"۔ کارین نے آنکھیں بند کر کے ایک بہت بڑا فیصلہ کر لیا اور واجد کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ محبت بھری موہوم مسکراہٹ بدھ کے ہونٹوں کو چھوتی پورے چہرے پر چھا گئی تھی۔ کارین کو جیسے اپنے فیصلے کی توثیق مل گئی۔

"ہاں مجھے بھی یقین ہے" _____ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت ڈاک بنگلے کا چوکیدار اسے ڈھونڈتا ہوا پہنچا۔

"آپ کا تار آیا ہے"۔

"میں بہت بیمار ہوں۔ فوراً واپس آ جاؤ"۔ کئی جگہوں سے پتے بدلتا ہوا آٹھ روز پہلے کا چلا تار اسے آج بدھ کے چرنوں میں ملا۔ وہ ماؤف ہو گئی اور دوسرے روز ہی دہلی پہنچ گئی۔

اتنے دنوں سے اس نے اخبار نہیں پڑھا تھا۔ ریڈیو نہیں سنا تھا۔ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جرمنی آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے سخت حیرت تھی کہ یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا۔

"میں بہت بیمار ہوں فوراً" آؤ"۔ دو اور تار اسی مضمون کے ملے۔

"آخر والا تار کیوں نہیں دیتے؟" کارین نے بہت پریشانی سے سوچا۔ وہ اتنی جلدی واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم واجد سے ملے بغیر ہرگز نہیں لیکن ایک دن بھی مزید رکنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے واجد کو لمبا سا تار دیا۔ اپنی مجبوری بتائی۔ جلد واپس آنے کا وعدہ کیا۔ اسے جرمنی آنے کی دعوت دی اور دوسرے روز ہوائی جہاز کے ذریعے جرمنی کے لئے روانہ ہو گئی۔

رہی جانے کی ان کو اتنی جلدی
کہ وہ دو چار دن بھی رہ نہ پائے
سدا اس پار ہی رہنا ہے جن کو
کوئی ایسوں سے کیسے دل لگائے

کارین اس زبان کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتی تھی مگر گیت کی اداس دھن اس کے خون میں رچ گئی۔

"ہیلو ____ کھانا کھالو"۔ ایئرہوسٹس اسے جگا رہی تھی۔ کھڑکی پر دھند جمع ہو گئی تھی۔ ہوائی جہاز کب کا سندھ کے ریگستان اور میدانوں پر سے گزر چکا تھا۔

"تم نے بہت کچھ پڑھا اور سنا ہو گا۔ فلموں میں دیکھا ہو گا۔ لیکن دنیا یہ نہیں جاننا چاہتی کہ جرمنی میں ایک بہت بڑی تعداد پر کیا بیتی۔ کیسی کیسی جنگ افراد نے اپنے دلوں اور ذہنوں میں اس جنگی پاگل پن کے خلاف لڑی۔ فاشزم کے خلاف لکھا، بولا، اذیتیں برداشت کیں اور جان دے دی۔ میرے والد پر بہت کڑا وقت آیا تھا" ____ کارین کہہ رہی تھی۔ لیلیٰ خاموش اسے دیکھتی رہی۔

وہ ان سے ملنے جیل گئی تو وہ ایک ٹوٹے ہوئے شکستہ انسان تھے۔ بڑی مشکل اور کوششوں سے انہوں نے اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر سنبھالا تھا۔

"کیا ہتھیار تاریخی سچائیوں پر فتح حاصل کر لیں گے؟ کیا انسان اتنا بے بس ہو جائے گا؟ تم مشرق سے آ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ وہاں لوگ کس طرح سوچتے ہیں؟"۔ کارین بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر سوچتی رہ گئی۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ ہر مرتبہ یہی ہوتا۔ وہ سوچتی کہاں سے شروع کروں اور ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا۔

"میں اس ملک میں پیدا ہوا۔ یہاں کے اداروں اور استادوں سے سچ بولنا، لکھنا اور پڑھانا سیکھا اور اب یہ کہتے ہیں کہ اس سچ کو جھٹلا دوں۔ کیا سیاسی مصلحتوں اور اقتدار کے بھوکوں کے لئے تاریخ کو مسخ کر دوں؟ بھول جاؤں انسانیت کے لئے اپنے فرائض کو۔ کیا آنے والی نسلوں پر میرا کوئی حق نہیں؟ تم سوچو تو ذرا"۔ آخری ملاقات میں وہ بہت مضمحل، تھکے ہوئے اور نا امید لگتے تھے۔ جھوٹ کی سازش میں شامل نہ ہونے کی انہیں اتنی بڑی سزا مل رہی تھی۔ کارین کا چھوٹا بھائی عروسی محاذ پر مارا گیا اور والد کا نام گمشدہ افراد کی فہرست میں آ گیا۔ اب اس کے پاس سوچنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے بہت وقت تھا۔

"جنگ میں صرف انسانی جانیں ہی تو ضائع نہیں ہوتیں۔ کلچر، تاریخ، انسانی قدریں، علم ادب، پیار محبت جو انسان کو انسان بناتا ہے وہ بھی تو خون ہو جاتا ہے۔ بعد میں یہی دشمن دوست بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ حال، ماضی اور مستقبل کیا واپس آ سکتا ہے جو میں نے کھو دیا۔" کارین آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ بارش تھم چکی تھی۔ باہر سناٹا بڑھ گیا تھا۔

"اور واجد"۔ لیلیٰ نے کارین کو غور سے دیکھا۔ پچاس برس پہلے کی نوجوان اور حسین کارین اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"ہاں واجد ____"

"بھول گیا ہو گا۔ عام مردوں کی طرح"۔

"نہیں نہیں۔ وہ اتنا عام نہیں تھا۔ برما کے محاذ پر جانے سے پہلے اس نے مجھے خط لکھا تھا۔ جو جنگ کے بعد ملا۔ اسی لفافے میں یہ تصویر بھی تھی۔" کارین نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"میں نہیں جانتا کہ کیوں لڑنے جا رہا ہوں۔ نسطائیت کے خلاف یا اس سامراجی نظام کے حق میں جس نے صدیوں سے مجھے اور میرے ہم وطنوں کو غلام بنا رکھا ہے۔ ـــــــ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ اس دنیا کو بچانے جا رہا ہوں جس میں مجھے، تمہیں اور ہمارے بچوں کو رہنا ہے۔ کارین میرا انتظار کرنا ـــــــ واپس نہ آیا تو میری موت کو پیار کا نام دے دینا۔ کارین ـــــــ کارین ـــــــ کارین ـــــــ"

بہت دن ہو گئے مجھ کو ترستے
مرے ساجن مگر اب تک نہ آئے

میرے ساجن مگر اب تک نہ آئے ـــــــ

"اتنی طویل یاد اور اتنا بے معنی انتظار"۔ لیلیٰ کے منہ سے نکل گیا۔

"طویل ـــــــ ہاں ـــــــ لیکن بے معنی ہرگز نہیں۔" کارین مسکرا دی۔ "تمہیں کبھی کوئی ملتا ہے۔ بہت مختصر عرصے کے لئے۔ مگر ان چند دنوں میں اس کے ساتھ اتنی مکمل روحانی، ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے کہ وہ چند روز ہی تمام عمر کو سیراب کرنے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ میں نے اس یاد کو پیار کا نام دے دیا۔ جنگ کے خوفناک اور نفرت سے بھرے دنوں میں میں اور میرے ساتھی امن کے محاذ پر کام کرتے رہے۔ میرے کتنے بیش قیمت ساتھی مارے گئے۔" کارین اپنے ساتھیوں کو یاد کر کے خاموش ہو گئی۔ "تم دیکھ رہی ہو کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے اداروں کا وہ ٹھوس جرمن وقار اور ٹھہراؤ کہاں گیا؟ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں نے دنیا کے بہترین فلسفی، مفکر، شاعر، ادیب، فن کار اور سائنس دان پیدا کئے لیکن آج ہم جس کھوکھلے ذہنی دیوالیہ پن کا شکار ہیں وہ کیا ہمارا کلچر ہے؟ برلن کو دیکھو۔ ایک اضطرابی اور ہیجانی کیفیت ہے اس ٹوٹے پھوٹے تقسیم شدہ شہر کی۔ میں اور میرے ساتھی جرمنی کو، ساری دنیا کو اس ذہنی انتشار اور جنگی ذہنیت سے بچانا چاہتے ہیں۔ ہم ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ کل ایک بہت بڑا احتجاجی جلسہ ہے"۔

"کہاں؟"۔ لیلیٰ نے کارین کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

پچھتر برس کی عمر میں وہ کتنی پر امید پر ہوش اور جواں ہمت تھی۔

"کیا میں چل سکتی ہوں؟"

"ضرور۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے میں سویرے ٹھیک پونے آٹھ بجے تمہیں ہوسٹل کے سامنے مل جاؤں گی۔" کارین نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "لیکن پہلے کچھ کھانا کھالو۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ میں ابھی تمہیں چھوڑنے چلوں گی۔"

گلابوں والی گلی

نیلم بشیر

میں نے گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے حیرت سے رانی آپا کی طرف دیکھا۔
ان کی آنکھوں میں کسی خوفزدہ ہرنی کی سی وحشت تھی۔ چہرہ زرد پھول کی طرح کمھلا گیا تھا۔
"سنبل۔ گلابوں والی گلی ــــــــ یاد ہے؟" ان کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔
میں نے آپا کی بات سن کر جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی۔ بھلا رانی آپا کو اس بات کا آج کیسے خیال آ گیا تھا۔ میری گرفت سٹیرنگ وہیل پہ کمزور پڑنے لگی۔ ریڈ لائٹ پہ گاڑی روک کر میں نے پہلے ساتھ بیٹھی اپنی بہن کی طرف دیکھا اور پیچھے مڑ کر ان دو نوجوان سکول کی طالبات کی طرف، جو اب میری اور آپ کی بیٹیاں تھیں۔ ہم دونوں کی بیٹیاں ایک ہی سکول میں پڑھتی تھیں اس لئے ہم کبھی کبھار انہیں سکول سے اکٹھے ہی پک کر لیا کرتے اور ڈراپ بھی کر دیتے تھے۔
ایرمال سے نہر کی خوبصورت شاہراہ پہ ڈرائیو کرتے کرتے آپا کا گلابوں والی گلی کا ذکر کرنا بہت عجیب تھا کیونکہ ہم سب ہی خوش گپیوں میں مصروف مزے سے گاڑی میں بیٹھے آپا کے گھر کی طرف ہی جا رہے تھے۔
مجھے یکدم سب کچھ یاد آ گیا۔
حالانکہ میرا خیال تھا کہ آپا کی طرح میں خود بھی اس واقعہ کو بھول چکی ہوں گی۔ میں نے اسے ذہن کے کسی ایسے تاریک گوشے میں جا پٹخا ہو گا جہاں لاشعور کی منوں بوجھل تہوں تلے دب کر وہ ہمیشہ کے لئے گم ہو چکا ہو گا۔
آخر اس بات کو گزرے بھی لگ بھگ پچیس برس ہو چکے تھے۔ اتنے عرصے میں تو بچپن کی بہت سی باتیں دھندلی یادیں بن جاتی ہیں۔ دھواں ہو جاتی ہیں۔

تب رانی آپا اور میں دونوں لیڈی گریفن گرلز ہائی سکول میں پڑھا کرتی تھیں۔ آپا میٹرک کی ہونہار طالبات میں شمار کی جاتی تھیں اور میں ہمیشہ کی طرح شوخ شرارتی لڑکیوں میں۔

ہم دونوں اکٹھے سکول آنے جانے کے علاوہ بھی پل پل ساتھ رہا کرتے تھے۔ صبح سکول جانے کے لئے کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ سے شاہو گڑھی کے لئے ایک یا دو نمبر بس لیتے اور اسی روٹ سے دوپہر کو واپس لوٹتے۔ راستہ کافی لمبا ہوتا تھا مگر رش، دھکم پیل اور آپس کی گپ شپ میں وقت اتنی جلدی گزر جایا کرتا تھا کہ پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔ احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ گھر سے اتنی دور پڑھنے جاتے ہیں۔
ریلوے ہیڈ کوارٹر کے شاہو گڑھی بس سٹاپ پہ اتر کر سکول تک پہنچنے کے لئے ہم نے ایک شارٹ کٹ رکھا ہوا تھا اگر ہم اس شارٹ کٹ کو استعمال نہ کرتے تو برٹ انسٹی ٹیوٹ سے ہو کر سکول پہنچنے میں کافی دیر لگ جاتی اور زیادہ چلنا پڑتا تھا۔

یہ شارٹ کٹ ایک پتلی سی گلی تھی جس میں سے گزرنا رانی آپا کو خاص طور پر اس لئے اچھا لگتا تھا کیونکہ وہ گلی انہیں فردوس بریں لگا کرتی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس گلی میں ایک ایسا گھر تھا جس کے مکینوں نے چاروں طرف گلاب ہی گلاب لگا رکھے تھے۔ دیواروں پہ گلابوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور ماتھے پہ گلابوں کے جھومر سجے ہوئے تھے۔ پورے مکان کی لینڈ سیکپنگ اس طرح کی گئی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا گویا اس نے گلاب پہن رکھے ہوں۔
لال، لال، نارنجی، گلابی پھول کو تازگی بخشتے اور عام سی گلی میں جان ڈال دیتے تھے۔

رانی آپا جیسی پھولوں کی عاشق تو وہاں پہنچ کر سلوموشن میں چلنے لگ جایا کرتی تھی کیونکہ پھولوں کو للچائی نظروں سے دیکھ لینے کے بعد ان کی یہ خواہش بھی ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طریقے سے ایک آدھ گلاب چوری کر ہی لیں۔ چوری کر لینے کے بعد وہ یوں مسرور اور مخمور، مغرور سی ہو کر اسے اپنے لوہے کے پرانے جیومیٹری

باکس میں رکھ کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد سونگھا کرتیں جیسے ان کے قبضے میں ملکہ الزبتھ کے تاج سے اڑایا ہوا کوہ نور کا ہیرا آ گیا ہو۔ آپا ہمیشہ سے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش اور ناخوش بھی ہو جایا کرتی تھیں۔

اکثر جب ہم گلابوں والی گلی میں سے گزرتے تو کچھ اور لڑکیاں بھی مل جاتیں اور ہم لوگ ایک گروپ سا بنا کر یوں سکول کی جانب چلتے رہتے۔ جس طرح نوجوان فاختاؤں کی کوئی ڈار مل کر پرواز کر رہی ہو۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا کہ گلی بالکل سنسان ہوتی۔ ایسے میں' میں اور رانی آپا اکیلے میں تیز تیز قدم اٹھاتے جلدی جلدی گزر جانا چاہتے۔

ایسی ہی ایک صبح جب بس جلدی مل جانے کی وجہ سے ہم گلابوں والی گلی تک جلدی آ گئے تو ہم نے دیکھا کہ گلی میں ابھی کوئی لڑکی نہیں پہنچی تھی۔ شکر کیا جب ہم نے اپنی کزن ذکیہ کو بھی آتے دیکھ لیا۔ امتحان آنے والے تھے اس لئے ہم تینوں آنے والے مشکل دنوں کی باتیں کرتے جا رہے تھے کہ یکدم ذکیہ نے جو کنارے پر چل رہی تھی ایک دلدوز چیخ ماری۔ اسی لمحے اس کی کاپیاں کتابیں زمین پہ جاگریں اور سر پہ لیا ململ کا سفید سوتی دوپٹہ ڈھلک گیا۔

چیتے کی سی تیزی کے ساتھ پیچھے سے آنے والے ایک سائیکل سوار نے اس پھرتی کے ساتھ ذکیہ کی طرف جھپٹا مارا تھا جس طرح کوئی بھوکی چیل ہوا میں اڑتے اڑتے صدقے کے گوشت کی بوٹی جھپٹ لینے کو داؤ مارتی ہے۔ کیچ کی کوشش کرتی ہے۔

روتی ہوئی ذکیہ کے قدم ڈول رہے تھے ہم دونوں بہنوں نے اسے سہارا دینا چاہا مگر وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ میں اس سائیکل سوار کو کچا چبا ڈالنا چاہتی تھی اور میرے منہ سے مغلظات جاری تھیں۔ رانی آپا البتہ خاموش اور خوفزدہ تھیں اس روز وہ اپنا روزانہ کا گلاب چوری کرنا بھی بھول چکی تھیں۔

کچھ روز سکول میں اس واقعہ کا تذکرہ ہوتا رہا کیونکہ اس عمر میں بچیوں میں ایسی باتیں ہوتی ہی بہت سنسنی خیز ہیں پھر سب بھول بھال کر امتحان کی تیاریوں

میں مصروف ہو گئے۔

اس روز انگلش کا پہلا پرچہ تھا۔ رانی آپا بہت خوش خوش سکول جا رہی تھیں کیونکہ انگریزی کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ ان کی انگریزی اتنی اچھی تھی کہ ان کی ٹیچرز کبھی کبھار دوسری طالبات کے پرچے بھی ان سے چیک کروا لیا کرتی تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کو اس روز بس میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے لیٹ بس لینی پڑی۔ دیر ہو جانے کی وجہ سے ہم تقریباً بھاگم بھاگ سکول کو جا رہے تھے۔

گلابوں والی گلی بالکل خالی پڑی تھی شاید سب لڑکیاں پہلے ہی جا چکی تھیں۔ رانی آپا امتحانی گتہ سینے سے لگائے گلابوں کو تکتی جا رہی تھیں اور میں رانی آپا کو۔ مجھ سے عمر میں بڑی ہونے کے باوجود کئی باتوں میں میں اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھتی تھی۔

"ہائے اللہ" رانی آپا کے منہ سے ایک سسکی سی نکلی۔

میں بھی پل بھر کو تو ساکت ہو کر رہ گئی۔ سامنے سے ایک سائیکل سوار آرام آرام سے سائیکل چلاتا آتا نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں کو ذکیہ کے ساتھ اس کی بدتمیزی یاد آ گئی اور ہم اپنے آپ کو پروٹیکٹ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ذکیہ کو تو اس لئے بھی پتہ نہیں چل سکا تھا کیونکہ وہ پیچھے سے چپکے سے حملہ آور ہوا تھا۔ اب کی بار ہمارے سامنے تھا ہم چوکنے ہو چکے تھے۔

اس سے نظریں نہ ملانے کی کوشش میں ہم نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ ہم اس کا چہرہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے کہ سائیکل کی گھنٹی نے ہمیں اس پہ نظریں ڈالنے پہ مجبور کر دیا۔ آپا نے ایک زور دار چیخ ماری اور میں نے بے اختیار ہو کر پاس پڑی ایک اینٹ ہاتھ میں اٹھا لی۔

سامنے سے آنے والی بے شکل ہیت نے اپنے آپ کو یوں ایکسپوز کر رکھا تھا کہ وہ ایک مافوق الفطرت عجیب و غریب انسان نما جانور دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے مکروہ ننگے پن کی نمائش کر کے وہ یوں فخریہ انداز میں پاس سے گزر گیا جس طرح یہی اس کی مردانگی کا ثبوت اور دلیل ہو۔

چند لحظوں بعد جب ہوش آیا تو وہ جانور کب کا وہاں سے جا چکا تھا۔

امتحانی کمرے میں پہنچنے کے بعد بھی رانی آپا کی ہچکیاں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ٹیچروں نے بہتیرا پوچھنا چاہا مگر رانی آپا گم صم رہیں، کچھ نہ بتا سکیں، روتے روتے پرچہ دیا۔

گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے میں ریڈ لائٹ پہ رکنے کے بعد اب دوبارہ چل پڑی تھی پیچھے بیٹھی ہوئی ہماری بیٹیاں چٹکے ہوں غنچوں کی طرح بے داغ معصوم اور بھولی بھالی گڑیاں دکھ رہی تھیں۔

"آپا گلابوں والی گلی کا کیا ذکر؟" میں نے ہولے سے آپا کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا اور پھر اس طرف دیکھنا شروع کر دیا جس طرف آپا کی نظر ٹکی ہوئی تھی۔ ایک بڑی سی وین میں دس پندرہ نوجوان مرد سوار تھے۔ زیادہ تر نے چادروں کی بکلیں اس طرح مار رکھی تھیں کہ ان کے جسم کا ہر حصہ پوشیدہ تھا۔ ان کے چہروں پہ اطمینان اور سکون تھا۔ ان کی وین کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جن میں سے انہوں نے متعدد کلاشن کوفوں کے منہ تھوڑے تھوڑے باہر کو ایکسپوز کر رکھے تھے۔ کالے کالے جھانکتے ہوئے کلاشن کوفوں کے اگلے حصے اپنی بدصورت تھوتھنیاں سجائے ایک عریاں نظارہ پیش کر رہے تھے۔

ان مردوں کے چہروں پہ بھی اپنی مردانگی کی نمائش کا تفاخر اور تبسم موجود تھا۔ "ننگے بے شرم۔" رانی آپا نفرت سے بولیں اور پیچھے بیٹھی ہوئی ہم دونوں کی معصوم کمسن، حیرت زدہ بچیوں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔